

زیادہ ہو۔ تب بھی ہمارے لفظ کھو جاتے ہیں۔ پھر اسی نے لب کھولے ”آیان..... میں آپ سے اپنے اس دن کے رویے کے لیے بھی معافی مانگنا چاہتی تھی۔ میں پہلے کبھی شدید دباؤ کے باوجود بھی اتنی جذباتی نہیں ہوئی لیکن جانے اس دن مجھے کیا ہو گیا تھا۔ مجھے یوں ایک لمحے میں ہی آپ کے سامنے اپنا من الٹ کر آپ کو پریشان کرنے کا کوئی حق نہیں تھا..... ہو سکے تو مجھے.....“ میں نے اس کی بات کاٹ دی ”آپ حق کی بات کر کے مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔ بات اگر حق کی ہے تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں آپ کی کسی عنایت کا حق دار نہیں.....“ وہ الجھتی گئی ”آخر آپ ایسا کیوں کہتے ہیں..... اگر کسی ایک شخص نے آپ کے کوئل جذبے کو پچانے میں بھول کر دی تو کیا آپ اس کی سزا زندگی بھر خود سمیت دوسروں کو بھی دیتے رہیں گے.....؟ کیا کبھی بھی ایسا کوئی نہیں آئے گا جو آپ کے پرانے دھم مندل کر پائے.....؟ کیا کوئی گھاؤ ایسا گہرا ہو سکتا ہے کہ اس کا مسیحا ڈھونڈے سے نکل پائے۔“

وہ اپنے معصوم سوالات کے جواب کے انتظار میں میرا چہرہ ہنکتی رہی۔ مسیحا خود گھائل سے شفا کی اجازت طلب کر رہا تھا۔ اب میں اسے کیسے سمجھاتا کہ وہ تو خود وہ طیب ہے کہ جس کی ایک شفا یا ب نظر کی طلب میں ہزاروں مریض عمر بھر اس کی چوکھٹ پر پڑے رہیں۔ پر میرا تو مرض ہی جدا تھا۔ میں نے اسے اپنی زندگی کے پہلے ہنگامے سے لے کر اب تک ہر بات دھیرے دھیرے بتانا شروع کی۔ امی، ابا، ریحان، چھوٹی، پھر کیفے فراق، میرے دوست، گہنا سے میری پہلی ملاقات، شیخ صاحب، ستارہ، حمید، نور اور پھر شوکی کے ساتھ میرا پہلا جھگڑا اور وہاں سے لے کر زمر دھو بیلی تک کے اس لمبے سفر کی ایک ایک بات اس کے سامنے کھول کر رکھ دی۔ درمیان میں سانس لینے کو کہیں نکلتا تو صرف سامنے بہتی ندی کے پانی کی سرسراہٹ ماحول کو زندہ رکھتی۔ فضا خود دم سادھے، بالکل خاموش میری کہانی سنتی رہی۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ درمیان میں کہیں ٹوکنے پر میں کچھ بھول نہ جاؤں، اور پھر جب میری داستان ختم ہوئی تو زمر دھو بیلی کے اونچے برجوں کے درمیان سے صبح کی سپیدی اندھیرے پر غالب آنے کو تھی۔ سچ ہے کہ ہماری زندگی میں اندھیرے یا روشنی سمیت کسی شے کو دوام حاصل نہیں.....

جس طرح ایک بھرپور روشن دن گزار چکنے کے بعد ڈھلتی شام اور رات کا اندھیرا ہمیں اداس کر دیتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ایک بھرپور کالی رات اور چاند ستاروں کے ساتھ کے بعد صبح کا دھیرے دھیرے چھاتا ہوا اجالا بھی انسان کو بے چین کر دیتا ہے۔ آنکھوں آنکھوں میں شپ کاٹنے کا لطف تو کوئی کسی شب گزیدہ سے پوچھے۔ ہم دونوں بھی اس رات کے شب گزیدہ تھے اور اب یہ صبح کی آمد ہمیں ایک دوسرے سے نظریں چرانے پر مجبور کر رہی تھی۔ رات کا فسوں ٹوٹ رہا تھا اور ہماری زبانیں ہمارے الفاظ کا ساتھ دینے پر مائل نہیں تھیں۔ میں نے فضا سے اجازت چاہی۔ واپسی کے لیے قدم بڑھائے تو اس نے مجھے آواز دی ”آیان.....“ میں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ سر جھکائے کھڑی تھی ”میں اس رات کو زندگی بھر کسی سرمائے کی طرح اپنی یادوں میں سمیٹ کر رکھوں گی..... اب میرے حافظے کو کسی مزید یادداشت کی ضرورت نہ ہو شاید.....“ میں نے اسے نظر بھر کر دیکھا ”میں اس اعزاز کو ہمیشہ یاد رکھوں گا.....“ میں پلٹ کر چل دیا۔ وہ وہیں کھڑی رہی ایک شہزادی کی طرح..... اپنی سلطنت کے ایک بنجارے کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ جب میں اپنے کمرے میں پہنچا تو صبح کا اجالا زمر دھو بیلی کے وسیع دالانوں میں اتر رہا تھا۔ شب بیت چکی تھی لیکن یاد شب ابھی باقی تھی اور شاید سد باقی رہنے والی تھی۔



باب 29

اور پھر صبح جب دیر سے میری آنکھ کھلی تو شہین کو فکر مند سا اپنے دروازے کے باہر کھڑا پایا ”اچھا ہوا آپ جاگ گئے۔ ناہید بٹیا کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ سخت تیز بخار نے آگھیرا ہے انہیں۔“ میں فوراً لباس تبدیل کر کے شہین کے ساتھ ناہید کے کمرے میں پہنچا۔ خانم خود اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہی تھیں۔ فضلہ مجھے وہاں نظر نہیں آئی۔ شاید وہ دوسری جانب حویلی کے مہمانوں کے ناشتے کا انتظام دیکھ رہی تھی۔ ناہید اپنے پیارے بابا کو پیٹیوں میں جکڑا دیکھ کر گزشتہ شام سے ہی سخت تباہ و کاٹھا لگتی اور اس کے ذہنی دباؤ کا کچھ ایسا ہی نتیجہ متوقع تھا۔ میں نے ماحول بدلنے کی خاطر اسے چھینڑا ”خود اپنی خدمت کروانے کا خوب بہانہ ہے یہ بخار بھی..... لیکن دھیان رہے ہم یہاں مہمان ہیں ملی.....“ خانم اور ناہید دھیرے سے مسکرائیں ”آیاں بھائی..... میں پہلے ہی اپنے میزبانوں سے بہت شرمندہ ہوں..... آپ اور شرمندہ نہ کریں مجھے.....“ خانم نے پیار سے اسے ڈانٹ دیا ”بیٹیاں اپنے گھر میں کبھی پرانی نہیں ہوتیں..... تم میری فضلہ جیسی ہی تو ہو.....“ کچھ دیر میں شہین رنگا کا پیغام لے کر آگیا اور میں مردانے میں چلا آیا۔ مجھے دیکھتے ہی رنگا نے پوچھا ”کیسی ہے وہ.....“ اسے شاید ناہید کی بیماری کی خبر مل چکی تھی ”تیز بخار ہے۔ خانم تیار داری کر رہی ہیں اس کی.....“

”اسی لیے میں نہیں چاہتا تھا کہ لاڈلی یہاں آئے..... اس حرام خور اسماعیل کی کھال کھنچنا اپنی پڑے گی.....“

”کس کس کی کھال کھنچو انہیں گے آپ..... ان زخموں کے نشان تو جاتے جاتے اپنی داستان سارے زمانے کو سنا جائیں گے..... ناہید کہیں اب آپ کو کھونے کے ڈر سے خود کو ہی نہ کھو دے.....“ رنگا نے موسیٰ کی طرف دیکھا ”دیکھ رہا ہے موسیٰ..... یہ دونوں بہن بھائی اب مل کر میری طنائیں کسنا چاہتے ہیں..... تو انہیں سمجھا تا کیوں نہیں کہ ہمارے دھندے میں واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہوتا..... اپنی دنیا کے راجہ گدھوں سے جان چھڑا بھی لوں تو پولیس اور کو تو ملی ساری زندگی جان نہیں چھوڑے گی۔ باقی ساری عمر یا سلاخوں کے پیچھے ہی کٹ جائے گی..... وہ تو نادان ہے ساجن..... پر تو کیوں نہیں سمجھتا.....؟“ ہماری باتوں کے درمیان نواب صاحب بھی پاشا کے ساتھ کمرے میں آچکے تھے ”بھئی کون کس کو نہیں سمجھ رہا.....؟“ رنگا نے نواب کو دہائی دی ”دیکھو نہ سرکار..... یہ بھی لاڈلی کے ساتھ مل گیا ہے..... کہتا ہے دھندا چھوڑ دوں.....“ نواب صاحب نے گہری سانس لی ”بھائی رنگا استاد..... اس معاملے میں تو میں بھی آیاں میاں کا ہی ساتھ دوں گا۔ ہم میں سے کوئی بھی آپ کو اب اپنی جان یوں جو حکم میں ڈالنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اگر آپ کو شہر میں رہنے میں کوئی اعتراض ہے تو آپ یہاں میرے پاس رہ سکتے ہیں۔ یہ ناہید بٹیا کا بھی اتنا ہی گھر ہے جتنا ہماری فضلہ کا.....“ سارا رنگا نے بے چارگی سے موسیٰ کی جانب دیکھا ”لوجی..... ہم دو کو رو رہے تھے، یہاں تو بڑے سرکار بھی انہی کے ہم نوا نکلے..... نواب صاحب..... ہماری دنیا میں زور کو سلام پڑتا ہے..... کمزور کو نگل جاتے ہیں..... اور رنگا کا زور اس کے اڈے کے بل پر ہی قائم ہے“ میں نے اپنا خیال ظاہر کیا ”بات اگر صرف طاقت کی ہے تو طاقت حاصل کرنے کے اور بھی بہت سے ذرائع ہیں مثلاً سیاست..... آپ ہمیشہ بادشاہ

دیکھا۔ ”لے چلیں گے اسے اس کے باوا کے پاس۔۔۔۔۔ اب تو اس نے امتحان بھی پاس کر لیا ہے۔۔۔۔۔ شاید اب وہ اسے معاف کر دیں۔۔۔۔۔“

مویٰ نے مجھے چھیڑا ”کیوں شہزادے۔۔۔۔۔ لڑے گا انکیشن ہمارے لیے۔۔۔۔۔؟“ میں نے سارنگا کی طرف دیکھا ”ہاں۔۔۔۔۔ اگر آپ دونوں یہ وعدہ کریں کہ میری جیت کی صورت میں ہمیشہ کے لیے اڈہ ترک کر دیں گے۔ یعقوب مینشن ہمارا ہیڈ کوارٹر بنے گا اور وہاں موجود سارے شاگرد استاد اور تمام کارندے ہمارا سیاسی عملہ ہوگا۔ وہاں کلائی اور زور کی مشق ہمیشہ جاری رہے گی لیکن وہ طاقت اب ہم سیاست کے میدان میں استعمال کریں گے۔ بولیں۔۔۔۔۔ منظور ہے میری شرط۔۔۔۔۔؟“ ہنسی مذاق میں شروع ہونے والی ایک بات نے اتنا سنجیدہ رخ اختیار کر لیا تھا کہ خود ہم نے بھی کبھی نہیں سوچا تھا۔ رنگا کسی گہری سوچ میں گم تھا ”انکیشن لڑنا آج کل اتنا آسان کام نہیں رہا سا جن۔۔۔۔۔ یہ پرانے گدھ کسی نئے پتھی کو اس آسان پر کہاں اڑنے دیتے ہیں بھلا۔۔۔۔۔؟ تیری جان خطرے میں پڑ جائے گی۔۔۔۔۔ ہماری دنیا میں تو پھر بھی لکار کر وار کرتے ہیں پھر وہاں پیٹھ میں چھرا گھونپنے کی ریت ہے پیارے۔۔۔۔۔ تجھے کیسے اس دوزخ میں جھونک دوں جہناں۔۔۔۔۔“

”میری زندگی اتنی قیمتی نہیں ہے۔۔۔۔۔ لیکن آپ کی زندگی سے ناہیدگی جڑی ہے۔ سینکڑوں خاندان ہیں جن کا چولہا قدرت نے آپ کے دم سے جلا رکھا ہے۔ میں اس آگ میں کودنے کے لیے تیار ہوں۔۔۔۔۔ اب آخری فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔۔۔۔۔“ میں ان سب کو گہری سوچ میں ڈوبا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

کالی کا علاقہ بھی اب رنگا کی راج دھانی میں شامل ہو چکا تھا۔ نواب کا بڑا بیٹا وقار کالی کی شکست کے بعد سے غائب تھا۔ مویٰ نے تیسرے دن ہی کالی کے اڈے کا انتظام سنبھال لیا تھا۔ نواب صاحب کو بھی حویلی کے انتظامات سنبھالنے کے لیے اب کسی نئے منیجر کی ضرورت تھی کیونکہ رحیم کے جانے کے بعد اب اس کی ذمہ داریاں نبھانے والا کوئی نہیں تھا۔ میرے ذہن میں بہت پہلے ستارہ کی کہی ہوئی بات گونجی کہ شیخ صاحب حمید کی بے روزگاری کی وجہ سے بہت پریشان رہتے ہیں۔ تیسرے روز مویٰ کسی ضروری کام سے شہر جانے کے لیے زمر حویلی سے نکلا تو میں بھی اس کے ساتھ تھا میں کیسے فراق کے پاس اترا تو وقت تھم سا گیا۔ شام کی چائے کا وقت ہو رہا تھا اور بیرے تیزی سے فٹ پاتھ پر لگی میزوں کی جھاڑ پونچھ میں مصروف تھے۔ کیفے کاریکارڈ پلیئر اپنی مخصوص چڑچڑاہٹ کے ساتھ سر بکھیر رہا تھا

کیسے قت میں ہائے۔۔۔۔۔ دل کو دل کی لگی پیاری

مہنگائی کے دور میں مہنگی ہوئی یاری یاری

دل کی لگی دل کو جب لگائی مار گئی

راشن والی لائن کی لمبائی مار گئی

پاؤڈر والے دودھ کی ملائی مار گئی

اور جتنا جو پیچنی چلائی مار گئی۔۔۔۔۔

باقی کچھ بچا تو مہنگائی مار گئی۔۔۔۔۔ مہنگائی مار گئی

ہائے مہنگائی..... مہنگائی مہنگائی..... تو کہاں سے آئی

تجھے کیوں موت نہ آئی..... کہ باقی کچھ بچا تو مہنگائی مار گئی..... مہنگائی مار گئی

آس پاس بیٹھا بابا بودا کلرک طبقہ گانے کے بولوں پر سر دھن رہا تھا۔ غریب جب غربت سے لڑتے لڑتے تھک جاتا ہے تو پھر وہ اپنے دل کی بھڑاس ایسی ہر بات اور شعر کو داد دے کر نکالتا ہے جس میں غربت اور مہنگائی کا ردنا روایا گیا ہو۔ یہ شاعر اور سیاست دان ایسی ہی باتیں کر کے ان کے دلوں میں پلٹے کسی لوے لنگڑے انقلاب کے غبارے سے بھی ہوا نکال دیتے ہیں اور غریب رات کو تھکا ہارا پھر سے آنے والے خیالی سہانے دنوں کی یاد میں بستر پر جا پڑتا ہے۔ کچھ ہی دیر میں میری آمد کی اطلاع سارے علاقے کو ہو چکی تھی اور پھر سب سے پہلے راجہ اور پھر مشی اور بالا دوڑتے ہوئے کیفے فراق کے ہال میں داخل ہوئے اور مجھ سے لپٹ گئے۔ میں نے مرزا کو شیخ صاحب اور ریحان کو اطلاع دینے کے لیے بھی کھلوا بھیجا تھا، کیونکہ میرے پاس وقت کم تھا اور مجھے موسیٰ کے ساتھ زمر دوحولی بھی پلٹنا تھا۔ میرے مستقبل کے منصوبے سن کر راجہ چلایا ”یہ تو کیا کہہ رہا ہے انو..... ایکشن..... نہیں نہیں.....“ مشی نے غور سے میری طرف دیکھا ”کیا تم سنجیدہ ہو.....؟“ میں نے گہری سانس لی ”شاید تین دن پہلے تک میں نے اس بارے میں سوچا بھی نہیں تھا لیکن اگر یہی ناہید کے اطمینان اور خوشی کا واحد ذریعہ ہے تو ہاں..... میں سنجیدہ ہوں.....“ بالے نے فکر مندی سے کہا..... ”لیکن سیاست خود ایک بہت بڑا گندہ تالاب ہے پیارے..... جو اس میں اترا..... وہ داغ دار ہی ہوا.....“

”ہاں..... جانتا ہوں میں..... ہم خود بھی تو تمام عمر اپنے ہی چنے ہوئے سیاست دانوں کو برا بھلا کہتے گزار دیتے ہیں لیکن ہم میں سے کوئی آخر یہ کیوں نہیں سوچتا کہ اگر یہ گندہ ہے تو اسے پاک کرنے کے لیے ہمیں خود اس جو ہڑ میں اترنا پڑے گا۔ ہمارے مسئلے حل کرنے کے لیے آسمان سے کوئی فرشتہ تو اترنے سے رہا..... جب تک ہم سیاست کو گندہ تالاب سمجھ کر اس کے کنارے بیٹھ کر اندر والوں پر صرف تنقید کرتے رہیں گے یہ پانی ہمیشہ ناپاک ہی رہے گا..... اسے تنھارنا ہے تو ہم جیسوں میں سے کسی کو تو پہل کرنی ہوگی..... میں مانتا ہوں کہ ہمارے ملک میں سیاست صرف پیسے اور طاقت کے بل پر کی جاتی ہے..... لیکن آج قدرت کی مرضی سے یہ دونوں لوازمات میرے ہمدردوں کے پاس موجود ہیں..... تو پھر یہ بازی کھیلنے میں بھی کیا حرج ہے..... ہم چاروں نے آج تک صرف اپنے دل کی مانی ہے..... ایک بار زمانے کی مان لینے میں کیا حرج ہے.....“

وہ سب میری بات سن کر خاموش ہو گئے لیکن ان کے چہروں پر چھائی فکر اور پریشانی صاف نظر آ رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں ریحان بھی وہاں پہنچ گیا۔ شیخ صاحب البتہ مرزا کو گھر میں نہیں ملے۔

میں نے اسے اپنی آمد گہروالوں سے چھپانے کی ہدایت کی تھی۔ ریحان نے مجھے بتایا کہ امی میری غیر موجودگی میں کافی بیمار پڑ گئی تھیں۔ البتہ میرا رزلٹ دیکھ کر ان کی طبیعت قدرے سنبھلی ہے۔ اب میرا نتیجہ دیکھ کر اندر دنی طور پر خوش ہوئے پر انہوں نے اپنی خوشی گہروالوں پر ظاہر نہیں کی۔ چھوٹی روزانہ شام کو میرا انتظار کرتی ہے اور امی حسب معمول ہر جمعرات کی شام میرے نام کا صدقہ نکالتی ہیں۔ ریحان نے میرا ہاتھ تھام لیا ”انویار..... تم کب گھر واپس آؤ گے..... بس اب یہ ضد چھوڑ دو..... ہم سب تمہیں بہت یاد کرتے ہیں۔ تمہاری واپسی کی راہ تکتے رہتے ہیں.....“ میں نے ریحان کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”کیا اب بھی.....؟“ ریحان نے نظریں جھکا لیں۔ مجھے میرا جواب مل گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا ”جس

دن ابا کو بھی میری کمی محسوس ہوگی میں ضرور لوٹ آؤں گا“ میں نے مرزا کو شیخ صاحب کے لیے ایک رقعہ لکھ کر دیا کہ وہ اپنے طور پر جمید کو پاشا صاحب سے رابطے کے لیے کہیں۔ اسے معقول تنخواہ پر حویلی کی نوکری مل جائے گی۔ کچھ دیر بعد موسیٰ کی گاڑی مجھے لینے کے لیے پہنچ گئی اور میں ان سب سے جلد ملنے کا وعدہ کر کے وہاں سے چلا آیا۔

نواب صاحب سارنگا کے زخم پوری طرح مندمل ہونے تک اسے وہاں سے منتقل کرنے کے حق میں نہیں تھے لیکن رنگا نے اپنی مجبوری ظاہر کی کہ اسے یعقوب مینشن سے نکلے بہت دن ہو چکے ہیں وہاں کا نظام درہم برہم ہو چکا ہوگا لہذا اس کا جانا ضروری ہے۔ نواب صاحب نے جاتے جاتے دو الفاظ میں رنگا کو پیش کش کی کہ میرے انکیشن لڑنے کی صورت میں ان کی خواہش یہی ہوگی کہ میرا سارا خرچہ وہ خود برداشت کریں۔ رنگا نے مسکرا کر ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھا ”میرے اور آپ کے پیسے میں کوئی فرق ہے بھلا..... دیکھیں گے وقت آنے پر..... ابھی تو میرا دل نہیں مانتا اس فیصلے کو..... ہم غنڈے ہی تہی..... پر سیاست دان نہیں ہیں.....“

لیکن جب ناہید کو پتہ چلا کہ میں نے رنگا کو اس دلدل سے نکالنے کے لیے سیاست کا درمیانی راستہ نکالا ہے تو اس نے وہیں زمر دحویلی کے بستر پر بخار کے دوران ہی بھوک ہڑتال کا اعلان کر دیا اور اس وقت تک اناج کا ایک بھی دانہ منہ میں نہ رکھنے کی قسم کھالی کہ جب تک اس کے بابا میرے پیش کردہ منصوبے کی منظوری کا اعلان نہ کر دیں۔ آخر کار باپ کو اپنی بیٹی کی ضد کے آگے ہار ماننا ہی پڑی۔ رنگا نے خود زمانے میں جا کر ناہید کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور اس روز سارنگا نے اپنی لاڈلی کو بہت عرصے بعد اپنے ہاتھوں سے ناشتہ کروا کر اس کی قسم توڑی۔ ہم سب زمر دحویلی سے رخصت ہوئے تو حویلی کے سبھی کمین بہت دیر تک مرکزی گیٹ پر کھڑے ہمیں رخصت کرنے کے لیے ہاتھ ہلاتے رہے، لیکن ان سب میں فضلہ شامل نہیں تھی۔ الوداع کہنے کے بعد میں نے اس کی آخری جھلک زمر دحویلی کے اونچے برج کی ایک منڈیر کے پیچھے دیکھی تھی۔ وہ وہیں سے کھڑی ہمیں رخصت ہوتے دیکھتی رہی۔

اگلے چند روز بے حد مصروف گزرے۔ رنگا نے یعقوب مینشن پہنچتے ہی باقاعدہ اخبار والوں کو چائے کی دعوت پر بلا کر یہ اعلان کر دیا کہ وہ اس بار انتخابات میں کسی بھی پارٹی کا ساتھ دینے کے بجائے خود اپنا نمائندہ کھڑا کر رہا ہے، اور وقت آنے پر اس نمائندے کے نام کا اعلان بھی کر دیا جائے گا۔ رنگا نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ وہ کسی بڑی پارٹی سے ٹکٹ لینے کے بجائے اپنے امیدوار کو آزاد میدان سے لڑانے پر بھی غور کرے گا۔ رنگا کے اس اعلامیے کے ساتھ ہی زیر زمین اور سیاست کے ایوانوں میں تھر تھری سی مچ گئی اور دونوں جانب سے اس پر شدید باڈ ڈالا جانے لگا کہ وہ اپنا یہ فیصلہ واپس لے لے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ سارنگا کس قدر دور اندیش تھا۔ اگر وہ اڈے کی گدی چھوڑ کر یہ اعلان کرتا تو واقعی دونوں اطراف کے ”بڑے“ اس کی ہڈیاں تک چبا جاتے، لیکن رنگا نے اڈے اور اپنے زیر زمین سرکار کے بل پر یہ فیصلہ لیا تھا لہذا رفتہ رفتہ سبھی خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہوتے گئے لیکن رنگا اب بھی ہر قدم نہایت پھونک پھونک کر اٹھارہا تھا اور اس نے کاغذات جمع ہونے کے آخری وقت تک میرے نام کا اعلان نہیں کیا، اور سب سے پہلے اپنے چار اطراف کے کلے مضبوطی سے گاڑنے کے بعد آخری تاریخ سے صرف ایک دن پہلے میرا نام سب کے سامنے ظاہر کر دیا۔ آیان احمد کے ہزاروں پوسٹر چھپ کر آگے اور علاقے کی ہر درو دیوار پر میرا نام چسپاں ہوتا چلا گیا۔ اس تمام عمل کے دوران

میرے سب سے تیز اور پر جوش ور علاقے کے وہی نوجوان ثابت ہوئے جن کو کبھی ہم نے ہفتہ خوری کے خلاف اکٹھا کیا تھا۔ مٹی، بالے اور رولہ کی سربراہی میں ہمارے علاقے کے سینکڑوں نوجوان صبح شام میرے حق میں لوگوں کی رائے بدلنے کے لیے لوگوں کے دروازے کھٹکھٹا رہے تھے۔ وہ جنہیں لوگ لوفر، آوارہ، ناکارہ اور نکما کہہ کر سداوتھکا کرتے آتے تھے۔ آج اپنے جیسے ایک لوفر اور آوارہ کے لیے اپنا تن من لگا کر اپنے دن رات ایک کیے دے رہے تھے۔ ان کے اندر کہیں نہ کہیں یہ بات بھی ضرور پلچل جاتی ہوگی کہ یہ انہی جیسے ایک آوارہ کی شناخت کی بازی ہے، اور وہ سب یہ بازی اپنی بازی سمجھ کر کھیل رہے تھے۔ ان کے پاس دنیا پر یہ ثابت کرنے کا آخری موقع تھا کہ وہ ناکارہ نہیں ہیں..... اگر انہیں موقع دیا جائے تو وہ بھی زمانہ جیت کر دکھا سکتے ہیں۔ میری فرمائش پر رنگا نے خصوصی طور پر انہی سبھی کے لیے روزانہ اور ہفتہ وار خصوصی معاوضے کا بندوبست بھی کر دیا تھا تاکہ انہیں گھر والوں کے طعنوں اور اعتراضات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ان میں سے خود کسی نے کوئی مطالبہ نہیں کیا لیکن میں جانتا تھا یہ سب نوجوان ہیں جو ہر گھر میں کہیں کسی عضو معطل کی طرح کھڑے پڑے رہتے ہیں ان کے لیے کبھی کوئی خاص برتاؤ نہیں ہوتا۔ ان کو کبھی اپنا کمرہ میسر نہیں آتا۔ کبھی کوئی خصوصی تقریب منعقد نہیں کی جاتی۔ ان کی فرمائش پر کبھی گھر میں کچھ خاص پکوان تک نہیں پکایا جاتا۔ ہر بار کسی چھوٹے یا بڑے بھائی یا کسی چچا زاد یا پھر کسی دور پار کے رشتے دار کی کامیابی پر انہیں طنز، طعنوں اور جلی کٹی باتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انہیں اپنی مرضی سے کسی کی مدد کرنے کا حق تک حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان کا شمار گھر کی سب سے ناقص اہل قسم کی مخلوق میں کیا جاتا ہے۔ ایسے میں اگر وہ گھر میں چار پیسے لاکروں کے تو کم از کم انہیں راتوں کو آوارہ گردی کے طعنے تو نہیں ملیں گے۔ گھر میں یہ پیسے نہ بھی دیں تو کچھ دن کسی کے آگے ہاتھ پھیلائے کی شرمندگی سے توجہ جانیں گے۔ وہ سب اب میرے ساتھی تھے اور میں ان سب کا آیان بھائی تھا۔ آخر کار وہ دن بھی آ گیا جب میرا پہلا جلسہ ہونا تھا۔ مقام وہی تھا جہاں سے میری کہانی شروع ہوئی تھی..... کیف فراق کے سامنے والی سڑک اور بابو کا لونی۔



عشق کا شین (III)

عشق کا عین اور عشق کا شین کے بعد کتاب گھر اپنے قارئین کے لیے جلد پیش کرے گا..... **عشق کا**

شین (II)۔ ناول ایک مکمل کہانی ہے۔ امجد جاوید کی لازوال تحریروں میں سے ایک بہترین انتخاب۔ **عشق کا شین (III)** کتاب

گھر کے معاشرتی رومانی ناول سیکشن میں پڑھا جاسکے گا۔

باب 30

اس روز صبح سے ہی آسمان پر گھنے سیاہ بادلوں اور ہلکی بدلیوں کے درمیان ایک دوسرے کو چھونے کی شرط بندھ چکی تھی اور سہ پہر تک ان سب نے مل کر آسمان کو پوری طرح ڈھک لیا۔ میں جب کیف فراق کے سامنے پہنچا تو بارش کی بوندیں موٹی اور تیز تر ہو چکی تھیں۔ موٹی نے برسات کے پیش نظر خدشہ ظاہر کیا کہ شاید لوگ زیادہ تعداد میں جمع نہ ہو پائیں لیکن جب میں نے مرزا کو باہر فٹ پاتھ پر کوئی میز رکھنے کا اشارہ کیا جس پر کھڑے ہو کر میں اپنے لوگوں سے بات کر سکتا تب تک چھتریوں کا ایک انبار ہمارے ارد گرد اکٹھا ہو چکا تھا۔ مرزا جلدی سے وہی میز اٹھالایا جس کے گرد ہم دوستوں نے بچپن سے لے کر اب تک جانے کتنے اور ان گنت لمحے ہنستے مسکراتے گزارے تھے۔ میں میز پر کھڑا ہوا تو مٹھی، بالے اور راجہ نے اسے مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ آج بھی میرے ساتھ میرے وہی پرانے سہارے جڑے ہوئے تھے۔ بارش کی بو چھاڑنے مجھے پل بھر میں نہلا سا دیا، لیکن باؤ کا لونی، سادات محلے اور آس پاس سے جوان، بزرگ، بوڑھے اور بچے نکلے چلے آ رہے تھے۔ میری فورس کے نوجوان ایک جانب جمع تھے اور سڑک پر دور دور تک صرف سیاہ چھتریاں پھٹی نظر آ رہی تھیں۔ چچا فراق نے سردی کے پیش نظر چائے کا خصوصی انتظام بھی کر رکھا تھا۔ راجہ نے ان سے ادائیگی کا پوچھا تو وہ رو پڑے کہ ”ادائیگی کرنی ہے تو پہلے ان چار سو ستر روپوں کی کرو جو انوکا اب تک کا ادھار ہے۔ بولو کر پاؤ گے ادا؟“ راجہ لا جواب ہو گیا۔ واقعی ہم ساری عمر بھی کما کر چچا فراق کی محبت کا وہ ادھار نہیں چکا سکتے تھے۔

میرے سامنے ان چہروں کا جھوم اکٹھا ہوتا جا رہا تھا جنہیں میں بچپن سے اپنے ارد گرد دیکھتا آیا تھا۔ ان میں سے بہت سے ایسے تھے جو مجھے اپنی گود میں کھلا چکے تھے وہ اپنے کامدھوں پر مجھے بٹھا کر کیف فراق سے واپس میرے گھر تک چھوڑ کر آیا کرتے تھے۔ آج وہ سب یہاں جمع ہو کر یہ سننے آئے تھے کہ ان کا انوان سے کیا کہنا چاہتا ہے میں جانتا تھا کہ اب انہیں آئیں گے نہ ہی وہ ریحان کو میرے جلسے میں آنے کی اجازت دیں گے لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں میری نظریں ان دونوں کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ تقریر کے لیے کھڑے ہوتے ہی میرے لفظ کھونے لگے۔ جنہوں نے مجھے بولنا سکھایا تھا ان کے سامنے بھلا تقریر کیسی؟؟ بڑی مشکل سے میں نے خود کو مجتمع کیا۔

”میں آج یہاں آپ لوگوں کے سامنے کوئی تقریر کرنے نہیں آیا۔ نہ ہی میں نئے وعدوں اور امیدوں کا کوئی پرانا جال لے کر آیا ہوں میں جو بھی ہوں..... آپ کے سامنے ہوں اور جو تھا وہ بھی آپ سے کبھی چھپا نہیں رہا..... میں کوئی لیڈر، سیاست دان یا انقلابی بھی نہیں ہوں کہ اگلے چند ماہ میں اس سڑک اس محلے اور اس علاقے کی ہر برائی کسی انقلاب کے ذریعے ختم کرنے کا دعویٰ کر سکوں۔ میں تو بس آیا ہوں۔ وہی پرانا انوان جس نے یہاں کے بزرگوں کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا ہے۔ وہی نالائق آیا ہوں جس کی شرارتوں پر آپ میں سے کبھوں نے اس کے کان بھی کھینچے ہیں۔ جس کی حرکتوں سے تنگ آ کر خود اس کے باپ نے اسے گھر بدر کر ڈالا۔ ہاں..... میں وہی آیا ہوں..... اور میں یہاں آج آپ کے سامنے صرف ایک عہد کرنے آیا ہوں کہ میں منتخب ہو کر بھی ہمیشہ یہیں آپ کے ساتھ رہوں گا۔ کوئی محل مجھے میرے جھونپڑے سے دور نہیں کر سکے گا۔ میں چنگی بجاتے ہی

مہنگائی تو شاید دور نہ کر سکوں لیکن راشن کی لائن میں آخر میں آپ مجھے بھی قطار میں کھڑا دیکھیں گے۔ گھی، آنا، جینی مہنگی ہوں گی تو میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ سڑک پر احتجاج کے لیے نکلوں گا جب آپ کے گھر اندھیرا ہوگا تو میں بھی اسی لوڈ شیڈنگ میں اپنے آگن میں پھروں کا سامنا کروں گا۔ بارش کا پانی آپ کے کپے گھروں میں داخل ہوگا تو میرا کوارٹر بھی سوکھا نہیں رہ پائے گا۔ جس بس اسٹاپ پر آپ گھنٹوں سرکاری ٹرانسپورٹ کا انتظار کریں گے میں بھی اسی ٹوٹے شیڈ کے نیچے کھڑا ہوں گا، اور وہی بس مجھے بھی میرے دفتر پہنچایا کرے گی، اور ہم اسی طرح ساتھ رہ کر اپنی بات اوپر کی سرکاری تنگ پہنچائیں گے۔ یاد رکھیں مجھے یہ سوچ کر دوٹ ہرگز نہ ڈالیے گا کہ میں راتوں رات اس علاقے کی تقدیر بدل دوں گا۔ ہاں اس اعتماد کے ساتھ ضرور ڈالیے گا کہ تدبیر کرنے والوں میں سے کل آپ کا ایک اپنا بھی ہوگا۔ جو ہمیشہ آپ کے ساتھ اور آپ کے اندر موجود رہے گا۔“

میں بات ختم کر کے خاموشی سے نیچے اتر آیا۔ کچھ دیر تک چاروں طرف ایک سناٹا چھایا رہا اور پھر سب سے پہلے مرزا کے ہاتھ آپس میں ٹکرائے اور پھر چند لمحوں میں تالیوں، نعروں اور سیٹیوں کا ایسا شور اٹھا کہ اس پاس سے گزرتی ٹریفک رک گئی۔ راجہ، بالا اور مشی تینوں مجھے کھینچتے ہوئے کیف فراق کے ہال میں لے گئے ”یار انو..... تو نے یہ باتیں کہاں سے سیکھیں۔ کیا تیرا رنگا استاد وہاں اڈے پر یہ تعلیم بھی دیتا ہے؟.....“ میں مسکرایا..... ”نہیں..... یہ باتیں وقت خود ہمیں سکھا جاتا ہے۔ البتہ مجھے یہ تعلیم ایک دوست سے ملی ہے..... ایک ایسا استاد جو خود کچھ سیکھنے کی چاہ میں مجھے بہت کچھ سکھا گیا.....“ میرے ذہن میں فضلہ کی کوئل غیبیہ لہرائی۔ واقعی..... یہ لفظ اور یہ سوچ اسی کی چند روزہ رفاقت کی دین تھے۔ شام کو میں ریگل چوک اور ریلوے اسٹیشن پر دو مزید جلے کرنے کے بعد یعقوب سینشن واپس پہنچا تو رنگا احاطے میں ہی دیگر استادوں کے ساتھ موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ سب مسکرائے۔ رنگا نے مجھے اپنے قریب بٹھالیا ”آگیا میرا سورا..... پہلے ہی دن جھنڈے گاڑ کے..... سنا ہے بابو کالونی میں بڑا زبردست بولا ہے تو..... تیرے مخالفوں کی نیندیں تو پہلے دن سے ہی حرام ہونے لگی ہیں۔ آیا تھا علاقے کا پرانا ایم پی اے کچھ دیر پہلے یہاں..... نوٹوں کا بریف کیس لے کر.....“ میں نے حیرت سے رنگا کو دیکھا ”نوٹ لے کر..... لیکن نوٹ کس لیے.....“

”جھے اپنے حق میں بٹھانے کے لیے اور تیری حمایت کا رخ اپنی طرف موڑنے کے وعدے کے لیے.....“ میں اب بھی الجھا ہوا تھا ”لیکن ملک صاحب تو پچھلے کئی الیکشن وہاں سے جیتتے آرہے ہیں میری حمایت تو بس علاقے کے ڈیڑھ دو سو بے روزگار نو جوان ہی کر رہے ہیں جنہیں سارا علاقہ لوفر کے نام سے پکارتا ہے۔ پھر مجھ سے خوف زدہ ہونے کی وجہ.....؟.....“ رنگا نے مسکرا کر موی کی جانب دیکھا ”دیکھ لیا موی..... یہ تیرا لاڈلا شگرد بھی ابھی تک تیری ہی طرح نادان ہے..... تو دیکھ لینا..... آگے چل کر یہی ڈیڑھ دو سو کئی ہزار کے لشکر میں تبدیل نہ ہوئے تو میرا نام بھی رنگا نہیں..... اپنے ملک کی عوام کو بس ایک امید کا ہی تو سہارا رہتا ہے..... اور آج تو نے وہ میدان کے دلوں میں جگہ دی ہے..... اب بہت دھیان سے رہو..... تیرے دوستوں کے ساتھ ساتھ تیرے دشمنوں کی تعداد بھی روز بروز بڑھتی جائے گی.....“

اور پھر اگلے چند ہفتوں میں رنگا کی بات سچ ثابت ہوتی گئی۔ میرے جلسوں کا حجم بڑھنے لگا اور مخالفوں کی جانب سے مجھ پر مختلف الزامات کی بوچھاڑ بھی شروع ہو گئی۔ کسی نے مجھے مافیا کا ایجنٹ قرار دیا تو کسی نے اسے رنگا استاد کی جانب سے اپنے بھاء بڑھانے کا گر بتایا۔ بوڑھے گدھ آسمان پر ایکا کرنے کے لیے جمع ہونے لگے تھے اور مختلف اتحاد بننے اور ٹوٹنے لگے۔ سارا رنگا کو مختلف بڑی پارٹیوں کی جانب سے اپنے رنگ زدہ

اور پرانے آزمائے ہوئے دھڑوں کے ساتھ انعام کی پیش کش ہونے لگی۔ بڑے بڑے پارسا اور برائے نام اصولی سیاست کرنے والے اپنا ظاہری چولا اتار کر میدان میں مختلف تراغیب کے ساتھ کود پڑے۔ کچھ ”بڑے شرفا“ نے پولیس اور قانون کی دھمکیاں بھی دیں اور کچھ چھپے ہوئے غنڈوں نے مصلحت کے انداز میں میری جان کو خطرہ ظاہر کرنے کا ڈھونگ بھی کیا۔ میں یہ سب حیرانی سے دیکھتا اور سوچتا رہتا کہ اگر رنگا میری پشت پر موجود نہ ہوتا تو شاید میں پہلے قدم پر ہی یا تو کسی ہسپتال میں گھائل یا پھر کسی حوالات میں مر غی یا بکری چوری کرنے کے الزام میں پڑا چھ ماہ کی کاٹ رہا ہوتا۔

سارنگا نے موسیٰ کو کہہ کر انتخابی مہم کے دوران میری حفاظت کا غیر معمولی بندوبست بھی کر دیا تھا۔ پولنگ میں اب کچھ روز ہی باقی رہ گئے تھے۔ نواب صاحب بھی درمیان میں دوسرے شہر کا چکر لگا چکے تھے۔ اسی دوران مجھے پاشا صاحب نے فضا کا یہ پیغام پہنچایا کہ اسے میری کامیابی کا شدت سے انتظار ہے، اور وہ اب اسی دن مجھ سے آکر ملے گی جب میری جیت کا ڈنکا چاروں طرف بج رہا ہوگا، لیکن ہمارے ہاں ایسی تبدیلیاں خون مانگتی ہیں اور ابھی میری کامیابی پر میرے کسی اپنے کے خون کا ٹیکہ لگنا باقی تھا شاید اس روز ہمیں ڈاک یا رڈ کے امیر یا میں جلسہ کرنا تھا۔ موسیٰ صبح سے انتظامات میں مصروف تھا۔ راجہ، مٹھی اور بالے نے اسٹیج کا انتظام سنبھال رکھا تھا اور باقی لڑکے پنڈال کے دیگر انتظامات کا جائزہ لے رہے تھے، لیکن جانے اس روز حکومت کی جانب سے فراہم کردہ سپاہیوں کی تعداد نصف سے بھی کم تھی۔ حوالدار نے بتایا کہ نفری کی کمی کی وجہ سے یہ مسئلہ درپیش تھا۔ اس روز ہجوم بھی معمول سے کچھ زیادہ تھا اور لڑکوں سے سنبھالنے نہیں سنبھل رہا تھا میں اسٹیج پر چڑھا اور میں نے ہاتھ اٹھا کر لوگوں سے خاموش ہو جانے کی درخواست کی۔ ٹھیک اسی وقت فار کی ایک آواز گونجی اور میرے دائیں جانب کھڑا ریگل چوک کا سلیم عرف سلو پلٹ کر پیچھے گرامیں نے گھبرا کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کے شانے سے خون ابل ابل بہہ رہا تھا۔ فوراً ہی دوسرے فار کی آواز آئی لیکن تب تک میرے بائیں کھڑا موسیٰ مجھے زور سے دھکا دے کر گرا چکا تھا۔ مگر گرتے گرتے بھی میں نے موسیٰ کے سینے سے خون کا ابلتا فوارہ دیکھ لیا تھا ایک افراتفری مچ گئی اور اڈے سے وابستہ لوگوں نے اگلے لمحے ہی اندھا دھند ہوائی فائرنگ شروع کر دی تاکہ حملہ آور ہمیں نہتا سمجھ کر مزید پیش رفت نہ کریں۔ گولی پرلی جانب کی کسی اونچی عمارت کی جانب سے چلتی تھی اور لڑکے پل بھر میں ہی اس عمارت کی چھت پر پہنچ چکے تھے لیکن وہاں انہیں سوائے دو چلی ہوئی گولیوں کے خالی خول کے علاوہ اور کچھ نہ ملا۔ چند لمحوں بعد ہی ہم موسیٰ اور سلو کو اپنی وین میں ڈالے قریبی ہسپتال کی جانب اڑے جا رہے تھے۔ موسیٰ کا سر میری گود میں تھا اور میرے کپڑے اس کے خون سے تر ہوتے ہوئے تھے میں موسیٰ کے گال تھپتھا کر اسے ہوش میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا ”کچھ نہیں ہوگا تمہیں..... میں تمہیں اتنی آسانی سے نہیں جانے دوں گا..... ہوش کرو استاد.....“ موسیٰ نے ذرا دیر کے لیے آنکھیں کھولیں مجھے دیکھ کر مسکرایا اور پھر بے ہوشی نے اسے بے سدھ کر دیا۔ سلو کا شانہ بھی بری طرح گھائل تھا لیکن وہ ابھی ہوش میں تھا لیکن اذیت کے مارے شدت سے آنکھیں میچے دین کے فرش پر راجہ کی گود میں سر ڈالے پڑا ہوا تھا۔ سارنگا کو کسی نے جلسہ گاہ سے ہی اطلاع کر دی تھی اور وہ تقریباً ہمارے ساتھ ہی اڈے کے سینکڑوں لوگوں سمیت، ہسپتال کے گیٹ سے اندر داخل ہوا۔ ہسپتال میں ایک ساتھ اتنے ہجوم کو دیکھ کر ایک سراسیمگی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی اور ڈاکٹروں نے بمشکل ان سب کو ایمرجنسی کے باہر والے گھاس کے میدان میں رکنے کی التجائیں کر کے ہجوم کو اندر آنے سے روکا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار رنگا کی آنکھیں بھیگی ہوئی دیکھیں ”ہوش کر موسیٰ..... اپنے استاد کے ساتھ یہ کھیل نہ کھیلا..... ساتھ رہیں ہیں ہمیشہ، ساتھ ہی چلیں گے ساجن.....“ لیکن رنگا کی باتوں کا جواب

دینے والا اور اس کے ہر حکم پر لبیک کہنے والا موسیٰ آج ہر سوال کے جواب میں خاموش تھا۔ سلوکو گھٹنے بھر بعد امیر منشی سے وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ وہ اب کچھ بہتر تھا لیکن موسیٰ کو جس آپریشن تھیز میں لے جایا گیا تھا اس کی سرخ ترقی پانچ گھنٹے سے زیادہ چلتی رہی اور ہم سب کسی سولی پر لٹکے باہر رابداری میں خود اپنے ہی چہرے نوچتے رہے۔ کچھ ہی دیر میں ریحان بھی رجبہ کے ساتھ ہانپا کا نپا دہاں آ گیا لیکن میری حالت کے پیش نظر وہ خاموش ہی رہا اور بس میرے شانے دبا کر اور گلے لگا کر تسلیاں ہی دیتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ میرے رشتوں کی کتنی گہری گانتھ ان انجانوں کے ساتھ بندھ چکی تھی۔ رات گئے نواب صاحب اور پاشا بھی شدید پریشانی کے عالم میں رابداری میں نمودار ہوئے، لیکن موسیٰ ابھی تک آپریشن تھیز میں تھا۔ جانے اس کی اندر کیا حالت تھی لیکن ہم سب یہاں باہر پل پل میں سوسو بار جی کر مر رہے تھے۔ ہسپتال کے باہر جمع ہوتا علاقے کے نوجوانوں کا ہجوم بے قابو ہو رہا تھا۔ اچانک میں نے اے سی پی بلال کو پریشانی کے عالم میں رابداری میں داخل ہوتے دیکھا۔

”ریگل چوک اور بابو کا لونی کے آس پاس ہنگامہ آرائی اور جلاؤ گھبراؤ شروع ہو چکا ہے۔ وہاں کے نوجوان شرانگیزی پر آمادہ ہیں اور باہر ہجوم بھی بے قابو ہو چکا ہے۔ میری آپ لوگوں سے درخواست ہے کہ کوئی میرے ساتھ چل کر ان سے بات کرے ورنہ آج سارا شہر جل جائے گا۔“

گم سم بیٹھے سارنگا نے شاید اے ایس پی کی بات سنی ہی نہیں۔ مجبوراً میں دھیرے سے اٹھ کر بلال کے ساتھ باہر گھاس کے میدان میں جمع ہجرے ہجوم کے پاس پہنچا۔ ان سب نے مجھے دیکھ کر میرے حق میں نعرے لگانا شروع کر دیے۔ ایک جوشیلا لڑکا جیج کر بولا ”ہم سارے شہر کو آگ لگا دیں گے انو بھائی۔۔۔۔۔ آج کوئی سرمایہ دار خدا نہیں بچے گا ہمارے ہاتھوں سے“ وہ سب ایک ساتھ چیخنے لگے۔۔۔۔۔

میں نے بڑی مشکل سے ان سب کو چند لمحوں کے لیے خاموش کرایا۔ ”اس وقت موسیٰ بھائی کو آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔ سلوکی جان اللہ نے بچالی ہے، لیکن اس کا خون بہت بہہ گیا ہے وہ بھی بستر پر پڑا اس منزل کو پانے کا انتظار کر رہا ہے جس کے لیے اس نے اپنا سیروں خون بہایا ہے“ دفعۃً ایک نوجوان آگے بڑھا اور اے ایس پی کی جانب اشارہ کر کے چلایا ”اس پولیس افسر سے پوچھ آیاں بھائی۔۔۔۔۔ یہ اس وقت کہاں تھا جب تم پر گولیاں چل رہی تھیں تب ساری علاقہ پولیس کہاں غائب تھی۔۔۔۔۔ یہ سب طے ہوئے ہیں آپس میں۔۔۔۔۔“

ایک بار پھر شور مچ گیا۔ میں نے چلا کر کہا ”خدا کے لیے آپ سب ہوش میں آ جائیں۔ دشمن یہی چاہتا ہے کہ ہم غصے میں اپنے حواس کھو کر ان کے منصوبے کے مطابق شہر میں ہنگاموں کے لیے نکل کھڑے ہوں تاکہ ہمارے ورکر اور ووٹر پولنگ کادن جیل یا ہسپتال میں گزاریں۔ اپنا یہ غصہ ایکشن والے دن کے لیے بچا کر رکھیں اور اسے دشمن کے خلاف اپنے ووٹ کی صورت میں نکالیں۔ ایک بار ہم جیت گئے تو پھر ان سب سے بھی نبٹ لیں گے تب ہم اس پولیس سے بھی جواب مانگیں گے کہ جس دن ہم پر حملہ ہوا خاص اسی روز نفری کم کیوں ہوئی۔ ہم گولی چلانے والوں کو جواب دیں گے لیکن اپنے ووٹ کی صورت میں۔ یہ صرف میری نہیں، رنگا استاد کی بھی خواہش ہے۔ آپ سب چاہیں تو یہیں خاموشی سے دھرنا دیں لیکن اس وقت بس دعا اور صرف دعا کریں یہی میری آپ سب سے التجا ہے۔۔۔۔۔“ میں نے بیگی آنکھوں کے ساتھ ان کے سامنے اپنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ان سب نے سر جھکا دیے اور پھر ہجوم میں سے ایک بزرگ نے باہر نکل کر دعا کے لیے ہاتھ فضا میں بلند کر دیے۔ باقی سب نے اس کی تقلید کی اور پھر ہم سب کی دعائیں عرش سے نکرانے کے لیے آسمانوں کی جانب پرواز کرنے لگیں اور پھر نہ جانے کس کی دعا عرش پار کر گئی اور جب میں دوبارہ رابداری

میں پہنچا تو پاشا صاحب نے جلدی سے بڑھ کر میرے کان میں سرگوشی کی کہ ابھی ایک ڈاکٹر نے باہر آ کر بتایا ہے کہ موسیٰ نے کچھ دیر کے لیے آنکھیں کھولی تھیں، لیکن ابھی اگلے چوبیس گھنٹے بہت زیادہ اہم ہیں۔ حالت بگڑ گئی تو سنبھالنا تقریباً ناممکن ہو جائے گا۔ میں نے کونے میں گم سم کھڑے سارنگا کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے چونک کر مجھے دیکھا ”وہ حرام خور ٹھیک تو ہو جائے گا نا ساجن..... ایسا بے وفا تو کبھی نہ تھا.....“ میں نے رنگا کا ہاتھ پکڑ لیا ”اسے کچھ نہیں ہوگا..... قدرت اتنی بے رحم نہیں ہو سکتی استاد..... موسیٰ کو واپس لوٹنا ہوگا۔ آپ کے لیے..... ہم سب کے لیے.....“ دفعہ رنگا نے زور سے جکڑ کر مجھے اپنے گلے لگالیا اور بچوں کی طرح ہڑک ہڑک کر رونے لگا ”اپنی ساری زندگی اس نکلے نے میرا حکم مانتے مانتے جلادی۔ میرے کہنے پر بلوے کیے۔ لوگوں کو اٹھایا۔ انہیں مارا پیٹا، کاٹ ڈالا ہر آگ میں آنکھیں بند کر کے کودتا چلا گیا۔ پر آج میں کتنا بے بس ہوں کہ جب اسے میری ضرورت ہے تو میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اس حرام خور کا تو خون بھی الگ نمبر کا ہے..... میرا خون بھی اس کے کسی کام کا نہیں..... اگر وہ اس طرح اوپر چلا گیا تو میں اوپر والے کو کیا جواب دوں گا؟..... اس کو تو کوئی جواب دینا بھی نہیں آتا..... خدا نے اس سے کچھ پوچھا تو وہ نیچے میری جانب ہی دیکھے گا۔ اور میرے پاس اس کے کسی سوال کا جواب نہیں ہوگا۔“

میں رنگا کی پیٹھ تھپکتا رہا۔ سارے زمانے کے لیے دہشت کی علامت سارنگا کو آج کوئی یوں معصوم بچوں کی طرح روتے دیکھتا تو شاید کبھی یقین نہ کرتا لیکن زندگی ایسی ہی انہونیوں کا نام ہے۔ کہیں پتھروں سے چشمے نکل آتے ہیں اور کہیں آنکھوں کا پانی بھی سوکھ کر پتھر بن جاتا ہے۔



دو بوندیں ساون کی

دو بوندیں ساون کی، ترجمہ ہے جغیری آرچر کے شہرہ آفاق ناول کین اینڈ ایپل کا جسے اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے علیم الحق حقی نے۔ دو بوندیں ساون کی کہانی ہے دو ایسے افراد کی جو ایک دوسرے سے شدید نفرت کرتے تھے اور ایک دوسرے کو شکست دینے اور تباہ و برباد کرنے کے درپے تھے۔ ان میں سے ایک منہ میں سونے کا جھج لے کر پیدا ہوا اور دوسرا بدر کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔ ایک شخص نے دنیا کے بہترین تعلیمی اداروں سے تعلیم پائی اور دوسرے کا استاد زمانہ تھا۔

یہ ناول کتاب گھر کے معاشرتی اصلاحی ناول سیکشن میں پڑھا جاسکتا ہے۔

باب 31

اور پھر موسیٰ نے دوبارہ آنکھیں کھولنے میں پورے تین دن لگا دیے اور یہ تین دن ہم سب نے اس کے کمرے کی باہر والی راہداری کے چھت کی کڑیاں گنتے اپنے پیروں پر کھڑے کھڑے گزار دیے رجبہ فٹشی اور بالے نے میری انتخابی مہم سنبھالنے کی بہت کوشش کی لیکن میری غیر موجودگی کی وجہ سے اس کا گراف تیزی سے نیچے گرنا چلا گیا۔ میرے ورکر لڑکے چلاتے رہے کہ ان آخری چند دنوں کی بڑی اہمیت ہوتی ہے اور میرے جلسوں سے غیر موجودگی کا فائدہ علاقے کا پرانا ایم پی اے خوب اٹھا رہا ہے اور وہ لوگوں میں یہ تاثر پھیلا رہا ہے کہ میں مقابلہ شروع ہونے سے پہلے ہی میدان چھوڑ گیا ہوں لیکن میرے لیے اس وقت موسیٰ کی جان اور صحت سے بڑھ کر اور کچھ نہیں تھا۔ رنگا نے بھی مجھ سے کئی بار کہا کہ منزل کے اتنے قریب پہنچ کر اب میں اُسے اپنے ہاتھ سے کیوں کھور ہا ہوں موسیٰ کا معاملہ اللہ کے سپرد کر کے اپنے محاذ پر نکل پڑو لیکن رنگا خود بھی جانتا تھا کہ میں موسیٰ کو یوں زندگی اور موت کی سرحد کے درمیان چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا، اور پھر قدرت کو ہم پر رحم آ ہی گیا اور تیسرے دن شام کو ڈاکٹر نے آ کر ہمیں اطلاع دی کہ موسیٰ کو ہوش آ گیا ہے، لیکن فی الحال ہم اُسے بے آرام نہ کریں تو بہتر ہے۔ یعقوب مینشن میں سات روز کے لیے نیاز کا لنگر کھول دیا گیا رنگا کچھ یوں جدے میں گرا کہ پھر ہم نے اُسے گھٹنوں اٹھتے نہیں دیکھا۔ جامع مسجد کے جس امام کو موسیٰ کی صحت یابی کے لیے خصوصی دعا کی درخواست کی گئی تھی۔ اُن سے ملنے کے لیے سارا یعقوب مینشن رنگا سمیت پیدل چل کر جامع مسجد پہنچ گیا۔ شہر کا ہر ضرورت مند مفلس اور بھکاری اس روز اڈے کے دروازے سے سارنگا کے ہاتھوں کچھ نہ کچھ لے کر ہی گیا۔ اگلی صبح ہمیں تھوڑی دیر کے لیے موسیٰ کے کمرے میں جانے کی اجازت ملی۔ ہمیں دیکھ کر موسیٰ کے زرد چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ رنگا نے اس کا ہاتھ تھام لیا ”اور کتنی روٹیاں توڑے گا تو اس ہسپتال کے لنگر کی موسیٰ..... چل اب گھر چلیں.....“ موسیٰ ہنس دیا، لیکن اس کی آواز نفاست سے بھر پور تھی ”ہسپتال کا لنگر کچھ بھی تو کتنے سال بیت گئے ہیں استاد..... یاد ہے چھٹی مرتبہ ہم دونوں ایک ساتھ ہی بھرتی ہوئے تھے.....“ رنگا کی آنکھیں نم ہونے لگیں ”ہاں..... پر اس بار تو نے بڑی غداری کی موسیٰ..... بڑا ستیا ہے تو نے ہم سب کو..... اور یہ تیرا شہزادہ..... دیکھ اپنا سارا راج پاٹ چھوڑ کر تیرے سر ہانے سے لگا کھڑا ہے کتنے دن سے..... یہ بھی تیری طرح بڑا ضدی ہے..... کسی کی نہیں مانتا اب تو خود ہی اسے سمجھا دے ذرا.....“

موسیٰ کو جب پتہ چلا کہ میں نے تقریباً اپنی الیکشن مہم ختم ہی کر دی ہے تو وہ شدید بے چین ہو گیا۔ ”نہیں شہزادے..... یہ کیا کیا تم نے..... لڑے بغیر ہی جنگ ہار دی..... کیا تم میرا بہا خون بھی ضائع جانے دو گے..... میرا بدلہ نہیں لو گے ان لوگوں سے.....“ میں نے موسیٰ کا ہاتھ تھپتھپایا ”تم ٹھیک ہو کر گھر واپس آ جاؤ..... یہی میری سب سے بڑی جیت ہوگی..... ویسے بھی..... میرے بہت سے دن ضائع ہو چکے ہیں اور کل تو انتخابی مہم کا آخری دن ہے“ لیکن موسیٰ کہاں ماننے والا تھا ”چاہے کچھ بھی ہو جائے..... لیکن یوں لڑے بغیر ہم کسی کے لیے میدان خالی نہیں چھوڑیں گے..... ہر استاد اپنے شاگرد سے اپنے ٹرکی کوئی بھیٹ چاہتا ہے..... آج میں بھی تم سے اپنی اُستادی کا معاوضہ مانگتا ہوں، اور میری بھیٹ یہی ہے کہ تم اپنی

جنگ آخر تک لڑو..... ہار یا جیت کے نتیجے کی پرواہ کیے بغیر ڈٹ کر مقابلہ کرو.....“

اتنے میں پاشا نے کمرے میں آ کر نواب صاحب کو اطلاع دی کہ حویلی کا مینجر خانم کا کوئی پیغام لے کر آیا ہے۔ نواب صاحب نے اُسے کمرے میں ہی بلا لیا اور جب حمید کمرے میں داخل ہوا تو وہ ایک لمحے کے لیے مجھے دیکھ کر ٹھٹھک کر رک گیا۔ میں خود بھی بالکل ہی بھلا بیٹھا تھا کہ خود میں نے ہی شیخ صاحب کو کہلوایا کہ حمید کو زمر دوحویلی کے مینجر کی نوکری کے لیے نواب صاحب کے ہاں بھیجوا یا تھا۔

حمید نے جلد ہی اپنے حواس پر قابو پا کر خانم کا پیغام نواب صاحب کو دے دیا۔ دراصل خانم موسیٰ کی صحت یابی کے بارے میں فکر مند تھیں اور انہوں نے اپنے طور پر نواب صاحب سے اجازت بھی طلب کی تھی کہ وہ موسیٰ کی صحت کے لیے حویلی میں ختم قرآن اور خصوصی دعا کی محفل منعقد کرنا چاہتی ہیں۔ نواب صاحب مسکرائے ”ہاں ہاں بھی کیوں نہیں..... اس میں بھلا اجازت طلب کرنے والی کیا بات ہے..... اور میاں تم جا کر خانم بی کو یہ بھی بتا دینا کہ موسیٰ استاد کی حالت اب بہت بہتر ہے، اور ہم سب اُنہی کے ساتھ ہیں۔“ حمید نے سر ہلایا۔ وہ ابھی تک اس حیرت سے ہی نہیں نکل پایا تھا کہ نواب صاحب جیسے وضع وارف شخص کا ان اڈے کے لوگوں کے ساتھ بھلا کیا رابطہ؟ اور تعلق بھی ایسا کہ گذشتہ تین دن سے وہ اسی ہسپتال میں ایک ایسے شخص کے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہے تھے کہ جسے سارا زمانہ ایک غنڈے کی حیثیت سے جانتا ہے۔ میں چپ رہا۔ نواب صاحب نے خانم کا بھیجا ہوا رقعہ پڑھنے کے بعد اپنی شیروانی کی جیب میں ڈال لیا اور میری طرف پلٹے ”اور آیان میاں..... تمہارے لیے بھی خانم بی کا خاص حکم نامہ ہے کہ انتخابات کے بعد پہلی فرصت میں زمر دوحویلی کا چکر لگاؤ۔ وہاں سب تمہیں اور ناہید بیٹیا کو بہت یاد کرتے ہیں۔“ میں سر ہلا کر رہ گیا۔ نواب صاحب نے حمید کو حویلی کے انتظامی معاملات کے بارے میں چند مزید ہدایات دے کر واپس بھیج دیا۔ کچھ دیر بعد میں کسی کام سے باہر نکلا تو حمید ابھی تک حویلی کے پرانے ڈرائیور کے ساتھ ہسپتال کے احاطے میں موجود تھا۔ مجھے باہر نکلتا دیکھ کر وہ تیزی سے میری جانب بڑھا ”میں سوچ رہا تھا کہ آپ کو کس طرح کمرے سے باہر آنے کا کہوں..... اسی شش و پنج میں ابھی تک یہیں کھڑا ہوں..... میں نے اُسے غور سے دیکھا..... کیوں..... سب خیریت تو ہے..... آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں.....“ حمید اب بھی کچھ الجھا ہوا تھا ”جب ابانے مجھے اپنے طور پر رقعہ لکھ کر زمر دوحویلی میں پاشا صاحب سے ملنے کا کہا میں جب ہی سے سوچ رہا تھا کہ ان کی واقعیت اتنے بڑے لوگوں کے ساتھ کب اور کیسے ہوئی تھی کہ صرف اُن کے ایک رقعے پر مجھے مینجر کی نوکری دے دی گئی۔ آج مجھے اپنے اُس سوال کا جواب تو مل گیا..... لیکن ذہن میں کچھ نئے سوال بھی جنم لے چکے ہیں.....“ میں نے اُسے تسلی دی ”اپنے دل میں کسی وہم کو جگہ مت دیجئے..... آپ کو آپ کی اہلیت کے مطابق نوکری ملی ہے..... جسے آپ ثابت بھی کر رہے ہیں..... اور یقین جانیے کہ اس بار آپ کا پالا بہت اعلیٰ ظرف اور خاندانی لوگوں کے ساتھ پڑا ہے..... اُن کی اڈے کے کسی شخص کے ساتھ وابستگی سے کوئی غلط اندازہ نہ لگا لیجئے گا۔“ حمید گم سم سا کھڑا تھا ”آج احساس ہو رہا ہے کہ میرے گذشتہ اندازے بھی کچھ درست ثابت نہیں ہوئے۔ ہو سکے تو میری معذرت قبول کر لیں۔ شاید میں بہت ظاہر پرست ہوں۔“ میں نے حمید کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے سب بھول جانے کا کہا اور خود آگے بڑھ گیا۔ ہسپتال کے احاطے میں جمع چند درکار لڑکوں کو شام کے لیے ہدایات دے کر میں کمرے میں واپس لوٹ آیا۔ میں نے موسیٰ کی خاطر یہ ہاری ہوئی لڑائی لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ اب میرے پاس وقت تقریباً ختم ہو چکا ہے لیکن اپنے محسن اور اپنے استاد کو چڑھاوا چڑھانے کے لیے

میں نے یہ آخری بازی لڑنے کی ٹھان لی تھی شام کو میں نے کینے فراق سے دوبارہ اپنی مہم کا آغاز کیا اور وہ رات ہم نے جاگ کر گزاری۔ میرے ساتھ رنگا کے دو ذاتی محافظ اور میرے کارندے لڑکوں کا ہجوم تھا اور ہم نے کینے فراق ریگل چوک، ڈاک یارڈ، پھول نگرا اور سادات محلے کا ہر دروازہ کھٹکھا ڈالا۔ سادات محلے میں شیخ صاحب کی گلی میں داخل ہوتے وقت میرا دل اُسی وحشی انداز میں دھڑکا۔ وقت نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ کہاں وہ کھلنڈ رالا پرواہ اور بے فکر سانا اور کہاں یہ ذمہ داریوں اور فرائض کے نیچے جھکا آیا۔؟

میں شیخ صاحب کے دروازے تک نہیں جانا چاہتا تھا لیکن گلی میں شور سن کر وہ خود ہی باہر نکل آئے اور پھر مجھے دیکھ کر وہ یوں بے تاب سے میری جانب لپکے جیسے کوئی اپنے کسی صدیوں سے پھڑے عزیز کی جانب لپکتا ہے۔ ”کہاں چلے گئے تھے آیاں میاں.....“ بھی میں تو اب تم سے ملنے کی امید ہی چھوڑ بیٹھا تھا..... بس شہر کی دیواروں پر لگے پوسٹرز پر ہی تمہارا ویدار ہوتا ہے اب تو..... کوئی ایسا بھی کرتا ہے بھلا اپنوں کے ساتھ.....؟؟؟“ میں شیخ صاحب کے گلے شکوؤں کے جواب میں صرف مسکرا کر ہوں ہاں ہی کرتا رہا۔ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا جیسے انہیں پھر سے میرے کہیں کھوجانے کا شک ہو۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ فرصت ملے ہی ضرور ان سے تفصیلی ملاقات ہوگی لیکن وہ بگڑ گئے ”کیا مطلب..... اب کیا دروازے سے یونہی پلٹ جاؤ گے..... ایسا ہرگز نہ ہوگا“ دو گھڑی کے لیے تو تمہیں گھر چلنا ہی ہوگا..... شیخانی جی کئی بار تمہارے بارے میں پوچھ چکی ہیں..... اور وہ سب حمید کی نوکری کے لیے بھی تمہارے بے حد شکر گزار ہیں..... ان سب کا دل تو زودو گے کیا.....؟“

میں نے بے چارگی سے رجا اور بالے کی طرف دیکھا۔ مٹی نے سر ہلا کر مجھے ان کے ساتھ جانے کے لیے کہا کہ وہ جب تک سادات محلے کی دیواروں پر میرے بقید اشتہار چسپاں کرتے ہیں تب تک میں کچھ دیر کے لیے شیخ صاحب کے ہاں سے ہواؤں، میں شیخ صاحب کے ساتھ ان کے صحن میں داخل ہوا تو مویہ کی اُسی مخصوص خوشبو نے میرے حواس معطر کرنا شروع کر دیے جو ان کے صحن کی کیاری میں ستون کے ساتھ لپٹی نیل سے پھوٹی تھی۔ ستارہ اور شیخانی جی برآمدے میں ہی کھڑی تھیں۔ شاید انہیں میری گلی میں آمد کی خبر پہلے ہی مل چکی تھی۔ شیخانی جی نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر میری کامیابی کے لیے بہت ساری دعائیں کر ڈالیں۔ ستارہ نے شکوہ کیا ”آپ تو ہمارے گھر کا راستہ ہی بھول گئے آیاں صاحب..... ابھی سے یہ حال ہے اپنے دوئرز کے ساتھ بے زنجی کا تو آگے چل کر کیا ہوگا.....؟“ ستارہ کی بات پر شیخ صاحب اور شیخانی جی زور سے ہنس پڑے۔ گہنا کہیں نظر نہیں آ رہی تھی اور جانے کیوں آج میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ میرے سامنے نہ ہی آئے تو اچھا ہے کہیں برسوں کی ”مشق جدائی“ اور ریاضت پل بھر میں خاک نہ ہو جائے۔

شیخ صاحب مجھے بیٹھک میں بٹھا کر چند لمحوں کی اجازت لے کر باہر نکل گئے۔ میں گم سم سا بیٹھا کمرے کے دروازے کو نکلتا رہا۔ اچانک درمیانی پردے کے پیچھے قدموں کی آہٹ ہوئی۔ میں سمجھا ستارہ یا شیخانی جی چائے لے کر آئی ہیں، میری نظر اٹھی اور وہ مجھے دروازے کے پتھوں بیچ کھڑی دکھائی دی۔ ہاں..... وہ گہنا ہی تھی، وہی..... سر تا پا گہنا..... سفید جوڑے پر وہی سیاہ شال..... گلابی مہتاب چہرے کو چھوٹی وہی ایک شریر سی لٹ..... کون کہتا ہے کہ ثبات صرف ایک تغیر کو ہے زمانے میں..... اور بھی بہت کچھ ایسا ہے جو کبھی بدلتا نہیں..... اُس کا یہ حسن بے پرواہ..... یہ بھی تو سدا یونہی قائم رہنے والا تھا۔ میں گہرا کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا، لیکن آج اُس کی وہ روایتی شوخی مفقود تھی۔ وہ کچھ الجھی الجھی..... کچھ کھوئی کھوئی سی

تھی۔ آداب کے بعد اُس نے مجھ سے پوچھا ”بہت دنوں کے بعد آپ کو ہماری یاد آئی۔۔۔۔۔ اور وہ بھی شائد ابا کے اصرار پر۔۔۔۔۔“ میں چپ رہا اُس نے میری خاموشی کو معنی پہنچا دینے ”حمید بھائی آج سہ پہر کو کچھ دیر کے لیے گھر آئے تھے حویلی لوٹنے سے پہلے۔۔۔۔۔ وہ آپ سے اپنی آخری ملاقات اور رویے پر بہت شرمندہ تھے۔۔۔۔۔“ میں نے چونک کر اُسے دیکھا۔ اس کا مطلب جس دن اس بینک میں میری حمید کے ساتھ آخری ملاقات ہوئی تھی، پردے کے پیچھے ہماری بات سننے والی گہنائی تھی۔ میں نے اس کا بوجھ ہلکا کرنے کی خاطر کہا ”آپ کے بھیا نے اُس روز بھی کوئی غلط بات نہیں کہی تھی۔ ایک بھائی کو اپنی بہنوں کے لیے اسی قدر فکر مند ہونا چاہیے۔۔۔۔۔“

”ہاں لیکن دوسرا کوئی اتنی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت نہیں دے سکتا تھا۔ آپ نے ان کی نوکری پکی کروا کر ابا کی بہت بڑی فکر دور کر دی ہے۔ انہوں نے آج تک یہ بات حمید بھائی سے چھپا کر رکھی تھی لیکن آج آپ سے ملاقات کے بعد یہ راز بھی ان پر کھل ہی گیا۔ وہ بتا رہے تھے کہ اب تو آپ ایک طرح سے ان کے مالکوں میں شمار ہوتے ہیں۔“ میں نے جلدی سے تصحیح کی ”نہیں نہیں۔۔۔۔۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔۔۔۔۔ نواب صاحب تو بس ایک مہربان بزرگ کی طرح ہیں۔۔۔۔۔ اور یہ ان کا بڑا پن ہے کہ وہ مجھے اپنے قریب محسوس کرتے ہیں۔“ لیکن گہنا آج کچھ اور ہی تھی۔ ”نہیں۔۔۔۔۔ حمید بھائی نے بتایا کہ زمر حویلی میں بھی سب چوبیس گھنٹے آپ ہی کے گن گاتے ہیں، اور نواب صاحب تو آپ اور آپ سے جڑے لوگوں کے بغیر سانس تک نہیں لیتے۔۔۔۔۔ آپ مجھے یہ بتائیں۔۔۔۔۔ اتنے بہت سے لوگوں کو کیسے جوڑے رکھتے ہیں آپ اپنے ساتھ۔ میں نے اپنی نظریں جھکائے رکھیں۔ ڈر تھا کہ کہیں پھر سے خود کو نہ کھودوں ”کہاں جوڑ پایا میں کسی کو اپنے ساتھ۔۔۔۔۔ میرے تو اپنے بھی مجھ سے چھوٹ گئے۔۔۔۔۔“

”جو آپ سے چھوٹ گئے۔۔۔۔۔ یہ ان کی اپنی قسمت ہے۔۔۔۔۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جلد وہ سب ایک بار پھر آپ کے ساتھ ہوں گے۔۔۔۔۔ ہم سب نے آپ کی کامیابی کے لیے بہت دعائیں کی ہیں۔“ میں نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اُس کی نظر جھک گئی۔ مجھے ہمیشہ کے لیے مات دینے والا آج میری جیت کی دعا کر رہا تھا۔ اس کے ہونٹ لرز سے گئے۔ وہ مزید کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن ٹھیک اُسی وقت ستارہ اور شبنامی چائے کے لوازمات کے ساتھ اندر داخل ہوئے اور گہنا بنا کچھ کہے اندر پلٹ گئی۔ کچھ دیر میں شیخ صاحب بھی تنویر سمیت بینک میں داخل ہوئے ”معاف کرنا میاں۔۔۔۔۔ میں ذرا سامنے والی گلی سے تنویر کو بلانے گیا تھا۔ یہ آج کل وہیں چند دوسرے طالب علموں کے ساتھ مقابلے کے امتحان کی تیاری کرتے ہیں سارا دن۔ تحریری امتحان تو پاس کر لیا ہے اب اللہ کرے کہ زبانی امتحان میں بھی سرخرو ہو جائیں۔۔۔۔۔“ میں نے تنویر کو تحریری امتحان کی کامیابی پر بہت مبارکباد دی۔ اُس نے بتایا کہ اگلے ہفتے ہی اس کا زبانی امتحان (Viva) ہے، اور اُس نے اپنی طرف سے تیاری میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ میں نے اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کیا اور شیخ صاحب سے واپسی کی اجازت چاہی۔ چلتے چلتے شیخ صاحب نے مجھے یہ اطلاع بھی دی کہ حمید چاہتا ہے کہ اُس کے گھر والے اب زمر حویلی کے اُس کوارٹر میں منتقل ہو جائیں جو نواب صاحب نے اُسے بطور مینجیر الاٹ کیا ہے۔ کیونکہ اس کی نوکری کے فرائض کچھ ایسے ہیں کہ اُسے چوبیس گھنٹے حویلی میں ہی گزارنے پڑتے ہیں۔ شیخ صاحب کے بقول وہ ہفتہ بھر میں حویلی کے کوارٹر میں منتقل ہو جائیں گے۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ وہاں ان کا پالا ظرف والوں سے ہی پڑے گا لہذا وہ اطمینان سے روانگی کی تیاری کریں۔

میں رات کو دیر سے یعقوب مینشن پہنچا، رات بارہ بجے سبھی اُمیدواروں کی ہم ختم ہو چکی تھی لیکن مجھے لوٹنے لوٹنے تین بج گئے۔ میں

آخری جلسے کے بعد موسیٰ کو دیکھنے ہسپتال پہنچا تو وہ اور رنگا میرے ہی انتظار میں تھے۔ میں نے موسیٰ کے سر ہانے بیٹھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ میں نے تمہاری ضد پوری کر دی۔۔۔۔۔ اور اب تمہیں میری مان کر جلد از جلد یہ بستر چھوڑ کر پھر سے ہمارے ساتھ کھڑا ہونا ہوگا۔ تم جانتے ہو مجھے تمہارے بنا چلنے کی عادت نہیں ہے۔۔۔۔۔ رنگا نے میرا شانہ دبایا، ”یہ بڑا حرام خور ہے بننا۔۔۔۔۔ اسے کھینچ کر یہاں سے لے جانا ہوگا ورنہ اس کی ہڈیوں کو بھی زنگ لگ جائے گا۔“ موسیٰ ہم دونوں کی باتیں سن کر مسکراتا رہا۔ رنگا نے زبردستی مجھے کچھ دیر کے لیے مینشن بھیج دیا کہ میں کچھ دیر کے لیے کمرنگا لوں لیکن میں اپنے کمرے میں پہنچ کر بھی بقیہ ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتا رہا، گہنا کی وہ بے چین آنکھیں مجھے تمام شب ستاتی رہیں، اور میں خود کو کوستار ہا کہ سب کچھ جانتے بوجھتے میں بار بار پلٹ کر اس کو چہرہ جھامیں جاتا ہی کیوں ہوں؟ اب تو تنویر نے اس جھاکش کی فرمائش پر مقابلے کا امتحان بھی پاس کر لیا ہے اور چند دن میں وہ آخری مرحلے سے گزرنے کے بعد افسر بن جائے گا۔۔۔۔۔ ویسا ہی افسر جیسا گہنا کے خوابوں میں رہتا تھا۔ جس وقت تنویر مجھے اپنے تحریری امتحان میں کامیاب ہونے کی نوید دے رہا تھا اس لمحے میں نے اس کی آنکھوں میں وہی خواب بسا ہوا دیکھ لیا تھا جو گہنا کی پلکوں تلے پلاتا تھا، مگر آج گہنا کی آنکھیں بے خواب سی کیوں تھیں؟ یونہی آنکھوں آنکھوں میں میری رات بھی بنا کسی خواب کے کٹ ہی گئی۔ کہتے ہیں خواب ہمیشہ بڑے دیکھنے چاہئیں تاکہ تعبیر بھی بڑی ملے، لیکن مجھ جیسے شور یہ سر کیا کریں کہ جن کی قسمت میں کوئی خواب ہی نہ ہو۔۔۔۔۔؟؟“

ایک دن کے بعد پولنگ تھی اور شہر کا ماحول تناؤ کا شکار ہوتا جا رہا تھا۔ رنگا نے اس روز خاص طور پر مجھے ہسپتال سے تنہا کہیں باہر جانے سے منع کر رکھا تھا اور میں دن بھر موسیٰ کے کمرے میں ہی اس کے ساتھ بیٹھا رہا۔ جانے کیوں مجھے اب کسی بھی چیز کے نتیجے سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ امتحان کا مزہ تب تک ہی رہتا ہے جب تک ہمیں کسی اچھے نتیجے کی آس یا بُرے نتیجے کا خوف رہتا ہے، لیکن اگر ہم اس آس اور خوف کی کیفیت ہی سے باہر نکل آئیں تو پھر کوئی امتحان، امتحان نہیں رہتا، بس ایک معمول بن جاتا ہے۔ میں بھی کسی ”معمول“ کی طرح بیٹھا اپنے سامنے اپنے باقی تمام ساتھیوں کو رنگا کی سربراہی میں اگلے روز ہونے والے اس امتحان کی تیاری کرتے ہوئے دیکھتا رہا، مگر خود میرے اندر ہار یا جیت کی تحریک شاید ختم ہو چکی تھی۔ جو اپنی زندگی کی سب سے بڑی بازی ہار چکا ہو اُسے پھر بھلا ان معمولی بازیوں سے کیا سروکار۔۔۔۔۔؟؟؟

آخر کار پولنگ کا دن بھی آن پہنچا۔ رنگا اپنی جیب میں مجھے بٹھا کر خود ڈرائیونگ کرتے ہوئے میرے حلقے کا جائزہ لینے کے لیے صبح سویرے اپنے باقی لشکر کے ساتھ نکل پڑا، موسیٰ نے جاتے وقت میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی اور اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ مجھ سے پھر کمرے میں زکا نہیں گیا اور میں تیزی سے باہر نکل آیا۔ دھوپ چڑھتے ہی پولنگ اور وڈروں کا مزاج بھی گرم ہوتا چلا گیا۔

شہر میں جا بجا دنگے فساد کی خبریں پھیل رہی تھیں، اور مخالفین اپنے حریفوں کو پچھاڑنے کے لیے اس روز ہر حربہ آزمانے کو تیار تھے۔ صبح سویرے سے گیارہ بجے تک ہمارے پولنگ اسٹیشن تقریباً ویران پڑے رہے، میری تین چاروں کی اپنی مہم سے غیر حاضری کے آثار اب دکھائی دینے لگے تھے۔ سارا رنگا بھی کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا نظر آیا۔ ”کیا کہتا ہے ساجن۔۔۔۔۔ تو بولے تو لڑکوں سے کہہ کر تیرے حلقے کی ساری پولنگ بند کروا دوں۔۔۔۔۔؟“ یہاں کا انکیشن ہی ختم کرائے دیتے ہیں۔۔۔۔۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا، ”نہیں۔۔۔۔۔ اگر وہ اندلی سے ہی جیتے تو پھر ہم میں اور ان میں فرق کیا رہ جائے گا جو آج سے پہلے بھی آپ کی طاقت کے بل پر جیتتے آئے ہیں۔ میں آج ہار بھی گیا تو ہم سب اسے آپ کی طرف سے انہیں ملی

فتوحات کا کفارہ سمجھ کر قبول کریں گے۔۔۔۔۔ بے ایمانی کی جیت سے ایمان داری کی ہار ہزار ہا بہتر ہے۔“ رنگا نے میرا شانہ تھپتھپایا۔۔۔۔۔ ”ٹھیک ہے جہاں۔۔۔۔۔ آج تیری خاطر یہ پہلی بار بھی قبول ہے سارنگا کو۔۔۔۔۔“

سارنگا اور میں نے اپنا ووٹ کیے فراق کے پیچھے بنے پرائمری اسکول کے پولنگ اسٹیشن میں ڈالا اور پھر اچانک ہی سے دوپہر بارہ بجے کے بعد رفتہ رفتہ لوگوں کا جھوم بڑھنے لگا۔ میرے پولنگ بٹھوس (Polling Booths) پر نو جوانوں کے جھگڑے نظر آنے لگے۔ یہ سارے آس پاس کے علاقوں کے وہ نو جوان تھے جن کی آنکھ ہی بارہ بجے دن کو کھلتی ہے۔ چند ایک اسٹیشنوں پر رنگا کے کارندوں اور دیگر امیدواروں کے ورکرز کے درمیان ہاتھ پائی اور سر پھٹول بھی ہوئی لیکن رنگا کو ان حالات کا تجربہ باقی سب سے کہیں زیادہ تھا۔ لہذا اس کے بندوں نے جلد ہی حالات پر قابو پا لیا۔ سہ پہر تین بجے تک میرے اور میرے مخالفین کے حامیوں کی تعداد تقریباً برابر نظر آنے لگی تھی، لیکن صبح کے تین گھنٹے کا وقت اب بھی میرے خسارے میں شامل تھا۔ شام ساڑھے چار بجے جب پولنگ کا وقت ختم ہونے میں صرف آدھا گھنٹہ باقی رہ گیا تھا، رنگا مجھے لے کر کیفے فراق کے پیچھے اسٹیشن پر آ گیا اور ہم وہیں صحن میں درخت تلے کچھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ یہ وہی پرائمری اسکول تھا جہاں میں راجہ، بالا اور فشی پڑھا کرتے تھے، اور آج بھی وہی تینوں اس پولنگ اسٹیشن کے انتظامات سنبھال رہے تھے۔ ہم اپنی بازی کا آخری داؤد کھیل چکے تھے اور اب صرف پتے پلٹے جانے کا انتظار باقی تھا، اور پھر اچانک میں نے جو دیکھا وہ میرے ہوش اور گمان کی سرحد سے بالکل پرے تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا اور میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ ریحان ابا کو لیے میرے پولنگ اسٹیشن کے گیٹ سے اندر داخل ہو رہا تھا۔



پارس

رخسانہ نگار عدنان کی خوبصورت تخلیق۔۔۔۔۔ معاشرتی اصلاحی ناول پارس کہانی ہے ایک لالہ ابالی کسٹ لڑکی کی، جس کی زندگی اچانک اُس پر نامہریان ہو گئی تھی۔ یہ ناول ہمارے معاشرے کے ایک اور چہرے کو بھی بخوبی اور واضح طور پر دکھاتا ہے اور یہ پہلو ہے ہائی سوسائٹی اور ان میں موجود برگر فیملیز اور نئی بگڑی ہوئی نسل۔ پارس ایک ایسے نو جوان کی کہانی بھی ہے جو زندگی میں ترقی اور آگے بڑھنے کے لیے شارٹ کٹ چاہتا تھا۔ قسمت نے ان دونوں کو ملا دیا اور کہانی نے نیاز رخ لے لیا۔ پارس ناول کتاب گھر کے رومانی معاشرتی اصلاحی ناول سیکشن میں پڑھا جاسکتا ہے۔

باب 32

چند لمحوں کے لیے تو مجھے یوں لگا کہ جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں، لیکن وہ تعبیر تھی۔ میری زندگی بھر کے دیکھے ہوئے خوابوں کی تعبیر.....

کہ کبھی اباجھے پر بھی اتنا ہی اعتماد اور اعتبار کریں جتنا انہیں ریحان پر تھا، میں یونہی گم سم کھڑا ان دونوں کو دیکھتا رہا اور وہ چلتے ہوئے میرے قریب پہنچ گئے۔ رنگا بھی ابا کو دیکھ کر حیرت سے کھڑا ہو گیا۔ میرے منہ سے سلام کے لفظ بھی نہ نکل پائے۔ ریحان نے مجھے ہوش میں لانے کے لیے زور سے کھٹک کر کہا ”کہاں گم ہو..... ابا تمہیں ووٹ ڈالنے کے لیے یہاں تک چل کر آئے ہیں.....“ میرے حلق میں ٹکین پانی کا پھندہ سا کستا چلا گیا اور میری آنکھیں بھینگے لگیں، میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر میری آواز بیٹھ چکی تھی۔ ابا نے اپنی چھڑی کا دستہ میری گردن میں ڈالا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے وہ بچپن میں ڈانٹنے اور مجھے سزا دینے کے لیے اُسے میری گردن میں پھنساتے تھے ”مجھے تمہاری جیت یا ہمارے کوئی غرض نہیں ہے نالائق..... لیکن اگر جیت کرتم نے اپنے وہ سارے وعدے پورے نہیں کیے جو تم نے اس علاقے کے لوگوں کے ساتھ کیے ہیں تو پھر اس چھڑی کو حسب معمول یاد رکھنا..... کھال ادھیڑ دوں گا تمہاری..... کیا سمجھ.....“ میری آنکھوں سے ہپ ہپ آنسو گرنے لگے۔ ابا دھاڑے ”اب روتا کیوں ہے گدھے..... چلو مجھے اپنا بوتھ دکھاؤ.....“ ابا دو قدم آگے بڑھے، سارا رنگا نے جلدی سے ان کی رہنمائی کی۔ میں اپنی جگہ جما کھڑا رہا۔ ابا نے پلٹ کر مجھے دیکھا اور پھر میرے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے، میں ہلک کر رونے لگا اور انہوں نے آگے بڑھ کر مجھے اپنے سینے سے لگا لیا، جانے کتنے جنموں کے بعد مجھے ان کے شانے پر سر رکھ کر رونے کا موقع دوبارہ ملا تھا۔ شاید میں ساتویں جماعت میں تھا جب سائیکل سے گرنے کے بعد چوٹ لگنے پر یوں ابا کے گلے لگ کر رو یا تھا، ابا مجھے تھپکتے اور ”ارے ارے“ کہتے رہے اور میں یونہی پھڑکتا رہا۔ آس پاس کھڑے میرے دوست بھی رونے لگے اور خود رنگا بھی مجھے اپنے آنسو پونچھتا نظر آیا۔ ریحان بھی میرے کا ندھے سہلاتے ہوئے سسکنے لگا۔ ابا کے لیے ہم دونوں کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ ”یہ لو..... چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں..... بڑے میاں بھی بس سبحان اللہ ہی ہیں..... اب بس کرو نا لائقو..... مجھے بھی زلاؤ گے کیا.....؟“ بڑی مشکل سے رنگا نے ہمیں سنبھالا اور ابا کے ہاتھوں میرے نام کی پرچی ڈبے میں ڈلوادی۔ ”مشی ہالے اور راجہ نے زور زور سے تالیاں پیٹ کر آسمان سر پر اٹھا لیا، اور پھر ان کی تالیوں کی گونج میں باقی افراد کی تالیاں بھی شامل ہوتی چلی گئیں۔ میں نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی سرخرو ہو گیا۔ میرے ابا نے میرے حق میں ووٹ ڈال کر مجھے ہمیشہ کے لیے فتح یاب کر دیا تھا، ریحان نے دھیرے سے میرے کان میں بتایا کہ امی اور چھوٹی کو وہ لوگ زنانہ پولنگ اسٹیشن پر چھوڑ آئے تھے۔ جاتے جاتے ابا نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی ”جیتے رہو.....“ اور اس دعا کے بعد آج میری زندگی ختم بھی ہو جاتی تو مجھے کوئی گلہ اور قدرت سے کوئی شکوہ نہ ہوتا۔ واپسی پر وہ چند قدم دور سر جھکائے اور کسی گہری سوچ میں گم رنگا کے پاس چند لمحوں کے لیے ٹھہرے ”صرف جنم دینے سے ہی کوئی باپ نہیں بن جاتا..... آپ نے بھی اپنا فرض خوب نبھایا..... اور کسی باپ کی طرح ہی آج تک اس کی حفاظت کی ہے..... میرا لوگوں کو پرکھنے کا نظریہ شاید اس دور کے لیے فرسودہ ہو چکا ہے..... لیکن یہ نئی نسل اپنے راستے خود بنا لیتی ہے..... ہو

سکے تو اسے گھر واپس بھیج دیجئے گا..... اس کی ماں ہمیشہ خود کو ہلکان کیے رکھتی ہے۔“ ابا رنگا کا کا ندھا تھپتھا کر آگے بڑھ گئے، اور رنگا کسی فرمانبردار بچے کی طرح سر جھکائے وہیں کھڑا رہا، اور ٹھیک اُسی لمحے نواب صاحب اور پاشا بھی پولنگ اسٹیشن میں داخل ہوتے نظر آئے۔ ابا نے چند گھڑیاں رک کر ان کے ساتھ سلام دعا کی اور آگے بڑھ گئے اور پھر نواب صاحب کی مسکراہٹ نے سارے بھید کھول دیے۔ وہ ہم سب کی لاعلمی میں جب ہم موسیٰ کی زندگی کے لیے ہسپتال کی راہداریوں میں سرنگراتے پھر رہے تھے، ابا سے مل آئے تھے۔ نواب صاحب کو اپنے دروازے پر ان کی گاڑی سے اترتا دیکھ کر چند لمحوں کے لیے ابا بھی پریشان ہو گئے ہوں گے، لیکن نواب صاحب نے انہیں الف تائے ساری کہانی سنائی اور ابا کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ جیسے ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی ٹھیک اُسی طرح ہر سیاہ کوئلہ نہیں ہوتا۔ کچھ ہیرے بھی اس کا لک میں دبے رہ جاتے ہیں نواب صاحب نے میرے حق میں دلائل دیتے وقت ضرور اپنا زور بیاں آخری حد تک صرف کر دیا ہوگا، ابا کون ان کے آنے سے پہلے ہی مجھ پر چلائی گئی گولی اور موسیٰ کا مجھے بچاتے ہوئے خود کو قربانی کے لیے پیش کرنا بھی علاقے کی پولیس اور لوگوں سے حرف بہ حرف منتقل ہو چکا تھا، اور پھر جب سارے محلے والوں نے ایک جاہور کابا کا در کھٹکھٹایا اور میری اس واحد تقریر کا ذکر کیا جس میں میں نے مرتے دم تک اُن کے ساتھ کھڑے رہنے کا وعدہ کیا تھا تو آخرا بکے دل کا سنگ بھی پگھل ہی گیا۔ حتیٰ آج نواب صاحب کے دلائل نے فراہم کر دی جب انہوں نے ابا سے صرف اتنا پوچھا کہ کیا انہیں نواب صاحب کے خاندان اور ان کے حسب نسب پر کوئی شبہ ہے.....؟..... اگر نہیں تو پھر وہ اپنے بیٹے پر اتنا یقین ضرور قائم رکھیں کہ اگر اُس میں اتنی صلاحیت نہ ہوتی تو آج وہ نواب صاحب کے گھر کا ایک فرد نہ بن چکا ہوتا۔ نواب صاحب نے ابا سے یہ بھی کہا کہ انہیں ہمیشہ یہ حسرت ہی رہے گی کہ آیا ان احمد ان کا اپنا بیٹا کیوں نہیں ہے..... میں چپ چاپ ایک طرف بیٹھا پاشا کی زبانی رنگا کو سنائی جانے والی یہ داستان سن رہا تھا جس نے ابا کی کایا پلٹ دی تھی۔ نواب صاحب کی فریاد اور دلائل کا نتیجہ آج میرے سامنے تھا۔ دونوں کے درمیان کبھی نہ مٹنے والے فاصلے اور سدا کی گہری غلیج کو آج انہوں نے پاٹ دیا تھا۔ آج ابا نے تسلیم کر لیا تھا کہ شاید ہم دونوں ہی کہیں نہ کہیں اور ہمیشہ درست ہوتے تھے، بس ہمارا نظریہ جدا تھا۔

پولنگ کا وقت ختم ہو چکا تھا اور مغرب کے بعد سرکاری عملہ تمام مواد اور ڈبوں سمیت جا چکا تھا۔ ہم سب یعقوب مینشن لوٹ آئے، رات گئے سرکاری ٹی وی پر دھیرے دھیرے ایک ایک کر کے نتائج بھی چلنا شروع ہو گئے۔ رنگا نے اتنے بڑے ہجوم کے ساتھ واپس موسیٰ کے پاس ہسپتال جانے کے بجائے وہیں مینشن کے بڑے احاطے میں کارندوں کو ٹی وی لگانے کا حکم دے دیا تھا۔ ہسپتال انتظامیہ ہم سے پہلے بھی کئی بار درخواست کر چکی تھی کہ ہمارے ساتھ موجود ورکرز کی بھیڑ سے باقی مریضوں کے آرام میں بہت خلل پڑتا ہے، البتہ ہماری درخواست پر موسیٰ کے لیے اُس کے کمرے میں خبریں لگا دی گئی تھیں۔ نواب صاحب اور پاشا وہیں موسیٰ کے کمرے میں ہی موجود تھے اور رات بھر وہ وہیں میرے آخری نتیجے کا انتظار کرنے والے تھے۔

یعقوب مینشن میں ایک ہنگامہ برپا تھا اور ہر بار جب ہمارے حلقے کے کسی نئے پولنگ اسٹیشن کے نتائج جمع کر کے دونوں کی گنتی بتائی جاتی تو چاروں جانب ایک شور مچا جاتا تھا۔ کچھ من چلے نو جوانوں نے باقاعدہ ڈھول بتاشوں کا انتظام بھی کر رکھا تھا، لیکن شروع کے نتائج میرے حق میں نہیں تھے اور پہلی بار انہیں ڈھول بجانے کا موقع رات ایک بجے کے بعد ملا جب سول لائن والے پولنگ اسٹیشن پر دو ٹوں کی گنتی میں میرا شمار

میرے قریبی حریف اور حلقے کے پرانے ایم پی اے سے کچھ زیادہ نکلا۔ میں اور پرانا ایم پی اے تقریباً ساتھ ساتھ ہی شمار میں برابر تھے، اور پھر رات تین بجے کے بعد جب حتمی نتائج کا اعلان شروع ہوا تو میں کئی علاقوں میں اس سے ہار رہا تھا۔ رنگا کے شاگردوں اور میرے جوان کارندوں کے چہروں پر مایوسی چھانے لگی۔ مجھے یقین تھا کہ کچھ ایسی ہی پڑمردگی مٹی، راجہ، ریحان اور بالے کے چہروں سے بھی چمک رہی ہوگی جو اس وقت کیفے فراق کے ہال میں مرزا اور چچا فراق سمیت محلے کے سبھی افراد کے ساتھ بیٹھ کر یہ نتائج دیکھ رہے ہوں گے، کالونی سے آنے والے ایک در کرنے مجھے یہ بتایا تھا کہ ہمارے محلے کے احاطے میں بھی ایک بڑائی دی رکھے محلے کی تمام خواتین اس کے گرد جمع بیٹھی یہ نتائج تک رہی تھیں۔ جبکہ امی اور چھوٹی کے بارے میں، میں یہاں بیٹھے ہوئے بھی یہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ دونوں حسب معمول جائے نماز بچھائے گزرتی اور میری کامیابی کی دعائیں اور فتنے مانگنے کے لیے سجدے میں پڑی ہوں گی۔ اس روز مجھے یہ بھی پتہ چلا کہ اینوں کے چہروں پر لمحہ بہ لمحہ پھیلتی ہوئی مایوسی کو دیکھنا کس قدر رازیت ناک ہو سکتا ہے۔ مجھ سے بھی رنگا اور اڈے کے باقی ساتھیوں کے چہرے پر پھیلتی ہوئی یہ تاریکی زیادہ دیر تک دیکھی نہ گئی اور میں نے احاطے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں جانے کا فیصلہ کر لیا لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ میرا اس طرح وہاں سے اٹھ جانا ان سب کو مزید اداس اور دکھی کر دے گا لہذا میں خود پر جبر کر کے وہیں بیٹھا رہا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا..... شاید امی اور چھوٹی کے سجدے قبولیت کی چوکھٹ پار کرنے لگے تھے، نتائج کے آخری لمحات میں میں اپنے حریفوں سے آگے نکلتا گیا اور پھر میرے اور پرانے ایم پی اے کے درمیان صرف چند دوٹوں کا فرق باقی رہ گیا۔ اب تک وہی ہر علاقے سے سب کو ہراتا آ رہا تھا لیکن جب خاص ریگل چوک، ڈاک یا رڈ اور سادات محلے کی حتمی کتنی ختم ہونے لگی تو میں اس کے قریب آتا گیا اور ایک لمحہ ایسا بھی آیا کہ ہم تقریباً برابر ہو گئے۔ رنگا سمیت تمام استاد، شاگرد، کارندے اور اڈے کا باقی سبھی عملہ حتیٰ کہ مرکزی گیٹ کے دربان بھی اپنی ڈیوٹی بھلا کر دم سادھے ٹی وی کے سامنے یوں بیٹھے تھے جیسے انہیں کوئی سانپ سونگھ گیا ہو۔ تقریباً تمام وارڈز اور کونسل کتنی کے معاملے میں بھگتائے جا چکے تھے، رنگا کے دستی فون سیٹ پر اس کے کارندے اُسے لمحہ بہ لمحہ بدلتی صورت حال سے بھی آگاہ رکھ رہے تھے اور رات بارہ بجے تک تو وہ فون رنگا کے کان سے ہی لگا رہا تھا لیکن اب بے دھیانی میں رنگا وہ فون بھی میز کے کنارے رکھ کر بھول گیا تھا اور اُس کی سبز بتی بار بار جل بجھ کر بند ہو رہی تھی لیکن اب فون سننے کا ہوش ہی کسے تھا، اور پھر بابو محلے اور کیفے فراق کی پولنگ اسٹیشن کا نتیجہ بھی آ گیا۔ کتنی کرنے والے اپنی کتنی بھول چکے تھے۔ دور سے کسی پڑھا کو نو جوان نے چیخ کر کہا۔ ”انوبھائی کے ووٹ برابر ہو گئے ہیں“ اسماعیل چلایا

”نہیں..... برابر نہیں..... یہ تو کچھ زیادہ بنتے ہیں.....“ آپس میں کچھ تکرار ہوئی اور کوئی تیسرا اٹھ کر رنگا کی طرف دوڑا ”مبارک ہو استاد..... اپنا انوبھائی تو جیت گیا ہے.....“ ہم سب نے بے یقینی سے اسماعیل کی طرف دیکھا اور پھر اچانک سکریں کے نیچے چلتی پٹی پر میرا نام جگمگایا ”غیر حتمی نتائج کے مطابق آ یا ان احمد پندرہ ہزار چار سو تیس ووٹ سے اول اور ملک نذیر پندرہ ہزار ستر ووٹ سے دوم رہے۔“ ایک لمحے کے لیے سب چپ ہو گئے اور ہم سب نے اپنی بصارتوں پر یقین کرنے کے لیے کچھ وقت لیا اور سب سے پہلے میرے مقابلے پر آنے والے استاد سلامی نے زور کا نعرہ لگایا ”اوئے بادشاہو..... انوبھائی جیت گیا ہے..... پھاڑ ڈالو آج سارے نگاڑے..... آواز آسمان تک جانی چاہیے نکمو.....“ اور پھر وہ طوفان آیا کہ واقعی یعقوب مینشن کے درود یوارز میں بوس ہونے لگے، رنگا نے بھاگ کر مجھے سینے سے لگایا اور ہوائی فائرنگ ڈھول اور نگاڑوں کی آواز سے

آسان لرزے لگا۔

ابتدائی نتائج کے مطابق میں قریباً تین سو دوئوں کے فرق سے اپنے حریف سے آگے رہتے ہوئے جیت چکا تھا، نوجوانوں نے بڑھ کر مجھے اپنے کاندھوں پر سوار کر لیا اور رنگا نے مینشن کے باہر رات بھر سے میری جیت کی اُمید میں بیٹھے فقیروں پر نوئوں کی برسات کر دی۔ ٹھیک اُس لمحے جب میرا نام دوسری مرتبہ سکرین پر آیا اور دوئوں کا فرق چار سو سے زائد بتایا گیا، تبھی قریبی مسجد سے فجر کی اذان گونجی ”اللہ اکبر..... اللہ اکبر.....“ واقعی اللہ عظیم ہے..... اُس نے مجھ جیسے بے گھر، بے آسرا اور بے نوا کو آج اتنا نواز دیا تھا کہ جسے پانے میں لوگ اپنی عمریں ضائع کر دیتے ہیں، اور پھر سب سے پہلے رنگا اور اس کے پیچھے تمام یعقوب مینشن سجدے میں گر گیا۔ یعقوب مینشن کے احاطے میں پہلی مرتبہ صفیں ڈال کر صبح کی نماز باجماعت ادا کی گئی جس میں سبھی ایک ساتھ سربسجود ہوئے۔ ٹھیک یہی مناظر کیف فراق اور ہمارے محلے کی مسجد میں بھی دہرائے گئے ہوں گے، آج اُن کا نوا بھی تو جیتا تھا۔ وہی آیان..... جسے ہارنے کی عادت سی پڑ گئی تھی، وہ آج جیتا تو یوں جیتا کہ اُس نے اپنوں کے ماضی کی تمام شکستوں کا بدلہ بھی چکا دیا تھا۔ روشنی ہونے سے پہلے ہی سارا محلہ ریحان کی معیت میں مجھے مبارکباد دینے کے لیے یعقوب مینشن کے دروازے پر جمع ہو چکا تھا، لیکن آج اُن سب کے لیے دروازے کھلے تھے، آج یہ کسی استاد کا اڈہ نہیں اُن سب کا اپنا گھر بن چکا تھا۔ مٹی، بال، رلجہ، ریحان، مرزا اور پچا فراق سبھی تو وہاں موجود تھے مجھ سے لپٹ کر مبارکبادیں دیتے ہوئے، میرے بال سہلاتے ہوئے، میرے گال کھینچتے ہوئے، شیخ صاحب تو باقاعدہ گھر کی کیاری سے جلدی میں بیروئے گئے پھولوں کے ہار لے کر آئے تھے جو تنویر نے آگے بڑھ کر میرے گلے میں ڈال دیے..... جانے اس تحفے کا نام کسی نے ہار کیوں رکھ ڈالا تھا، اس کا نام تو جیت ہونا چاہیے تھا، کہ اس کا تعلق تو سدا فتح سے ہی رہا ہے، ابا کے بارے میں پوچھنے پر ریحان نے مجھے بتایا کہ انہوں نے شکرانے کے لیے کچھ نیاز مانگ رکھی تھی۔ امی وہ بانٹ دیں، تبھی وہ گھر سے نکلیں گے۔ میں نے اُسی وقت رنگا سے گھر چلنے کا کہا اور ہم سب کچھ ہی دیر میں پیدل ہی گھر کی جانب چل پڑے تھے۔ راستے میں میری فتح کا جشن مناتے میرے نوجوان ورکر اور ساتھی ہمارے ساتھ چلتے گئے..... اور قافلہ بنتا گیا..... میں گھر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو میرے ذہن میں، گھر چھوڑتے وقت کا اپنا جملہ گونجا ”اب میں اُسی وقت یہاں قدم رکھوں گا جب آپ کو کچھ بن کر دکھاؤں گا.....“ غصے اور شدید جھنجھلاہٹ میں کہی گئی ایک بات کو قدرت نے میری دعا میں بدل دیا تھا۔ سچ ہے آپ کب دعاؤں میں اور دعائیں کب آہوں میں بدل جاتی ہیں..... یہ کوئی نہیں جانتا۔ امی نے دعا ختم کر کے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور پھر مجھے دروازے میں کھڑے دیکھ کر وہ وہیں بیٹھے بیٹھے رو پڑیں۔ میں نے لپک کر ان کے ہاتھ تھام لیے..... ”اپنے انوکھے شے کا بھی نہیں پوچھیں گی کیا.....؟“ کچھ ہی دیر میں چھوٹی اور ابا بھی برآمدے میں میرے گرد جمع ہو چکے تھے، ریحان باہر گلی میں رنگا اور باقی ہجوم کے ساتھ کھڑا میرے حق میں رلجہ اور مٹی کے ساتھ مل کر نعرے لگا رہا تھا ”اپنا انو..... آوے ہی آوے..... دشمنوں کے دل پر..... چھاوے ہی چھاوے.....“ ابا نے مجھے ایک بار پھر یاد دلایا ”آیان..... اپنے کہے ہوئے وعدوں کو بھول نہ جانا..... آج تمہاری خاطر یہ جو پورا علاقہ باہر اُٹھ رہا ہے..... انہیں تمہاری صورت میں ایک نئی اُمید نظر آ رہی ہے..... وہ آس جو شاید برسوں پہلے مر چکی تھی، اب تمہاری صورت پھر زندہ ہونے لگی ہے..... اسے اب دوبارہ مرنے نہ دینا..... ورنہ یہ سب جیتے جی مرجائیں گے.....“۔

”آپ مطمئن رہیں۔ میں اپنا کوئی وعدہ نہیں بھولا۔۔۔۔۔ یہی محلہ اور یہی گھر ہمیشہ میرا مرکز رہے گا۔ انہیں مجھ سے ملنے کے لیے کسی اونچی فصیل کو پار نہیں کرنا پڑے گا۔“ ابا مسکرا دیے ”جیتے رہو۔۔۔۔۔“

باہر گلی میں لگتے نعروں میں تیزی آنے لگی تھی۔ میں جلدی سے امی کے ہاتھ کی چائے اور چھوٹی کے ہاتھ سے بنے پراٹھے کے چند لقمے لے کر باہر نکل آیا۔ پھر وہ سارا دن کیسے لمحوں میں گزر گیا مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔ ہم ہسپتال پہنچے تو موسیٰ اور نواب صاحب میرے ہی انتظار میں بے چین بیٹھے ہوئے تھے۔ رنگا موسیٰ کو دیکھتے ہی چلایا ”لے بھی موسیٰ۔۔۔۔۔ تیرا شاگرد تو استادوں کو بھی مات دے گیا۔۔۔۔۔ ایم پی اے بن گیا ہے تیرا لاڈلا۔۔۔۔۔“ آج موسیٰ کے پاس بھی مجھے دینے کے لیے وہی تھکے تھے۔ یہ آنسو بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں۔ خوشی ہو یا چاہے غم۔۔۔۔۔ دونوں مواقع پر ہماری آنکھوں کا ساتھ نبھانے کے لیے اُن کے یہی ساتھی سب سے پہلے دستک دیتے ہیں۔ میں بس موسیٰ کو تھپکتا رہا۔ جانے یہ آہنی نظر آنے والے میرے بڑے اندر سے اتنے موم کیوں ہوتے جا رہے تھے۔ یا شاید یہ موم سداسی سے ان کے اندر کا حصہ تھا، صرف کسی اپنے کی آج کی کمی تھی۔ نواب صاحب نے مجھے خانم اور فضلہ کی جانب سے بھی ڈھیروں مبارک باد کا پیغام سنایا اور یہ بھی کہ وہ سبھی زمر دھوبلی کے تمام کینوں کے ساتھ میرا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ لیکن مجھے حویلی جاتے جاتے بھی تین دن لگ ہی گئے، کیونکہ اگلے دن موسیٰ کے زخموں کے ٹانگے کھلنا تھے اور دو دن ابتدائی نتائج حاصل کرنے اور علاقے کے معتبرین سے ملنے میں نکل گئے۔ تیسرے دن جب میں رنگا اور اسماعیل کے ساتھ حویلی پہنچا تو سورج ماند پڑ رہا تھا اور عصر کے وقت کی نرم سر دیوں کی دھوپ نے زمر دھوبلی کے کلش دہکار کھے تھے، چاروں طرف سنہری دھوپ کا سونا نکھرا ہوا تھا۔ خانم اور نواب صاحب نے حویلی کے والاں میں ہی میرا استقبال کیا۔ خانم بہت خوش نظر آ رہی تھیں۔ ”لا کے۔۔۔۔۔ تم نے آخر کر دکھایا۔۔۔۔۔ شاید تمہارے لیے ہی کہا ہے کسی نے کہ ناممکن لفظ کا وجود نہیں ہوتا۔۔۔۔۔“ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا ”سب آپ لوگوں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔“ اچانک پیچھے سے فضلہ کی شرارتی آواز ابھری ”اچھا جناب آیان احمد صاحب۔۔۔۔۔ گویا ہماری دعاؤں کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے سارے فسانے میں۔۔۔۔۔“ فضلہ کی بات سن کر سبھی مسکرا دیے۔ نواب صاحب رنگا کو لے کر خانم کے ساتھ اندر کی جانب بڑھ گئے۔ میں اور فضلہ ان کے پیچھے چل پڑے، اچانک فضلہ رُک گئی۔

”آیان۔۔۔۔۔“ میں نے بھی رُک کر دو قدم پیچھے کھڑی فضلہ کو دیکھا۔ ”میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ یہ آوارہ جوگی اور بنجارہ ایک دن زمانے بھر کو جیت لے گا۔ میری پیشین گوئی کا کوئی انعام نہیں دیں گے آپ۔۔۔۔۔“ میں مسکرا دیا ”انعام بھی آپ ہی بتا دیں نجمون جی“ فضلہ بھی ہنس پڑی۔ ”چلیں۔۔۔۔۔ یہ طے رہا کہ وقت آنے پر یہ نجمون اپنا انعام مانگ لے گی۔۔۔۔۔“ اتنے میں اندر سے خانم ہمیں بلانے کے لیے باہر چلی آئیں، اور ہم دونوں ان کے پیچھے اندر ہال کی جانب بڑھ گئے، جانے کیوں اس روز مجھے خانم کا چہرہ اور آنکھیں یہ کہتی ہوئی نظر آئیں کہ وہ اپنی فضلہ کے دل کے ہر راز سے آشنا ہیں۔



باب 33

اس روز کھانے کی میز پر میں نے نواب صاحب کے چھوٹے بیٹے سجاد کو بھی بہت دن کے بعد دیکھا، میں نے بڑے بیٹے کے بارے میں پوچھا تو نواب صاحب کے چہرے پر اُداسی چھا گئی۔ ”وہ ناخلف اب مجھے معافی کی درخواستیں بھجوا رہا ہے، اور خانم بھی اُس کی طرف داری کرتی رہتی ہیں کہ مجھے اُسے معاف کر دینا چاہیے۔“ میں نے بھی خانم کی تائید میں کہا ”اگر وقار کو واقعی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے تو آپ کو اُسے معاف کر دینا چاہیے۔۔۔۔۔ شاید یہ آخری ٹھوکراُس کے لیے سبق آموز ثابت ہوئی ہو۔“ نواب صاحب نے ہتھیرا ڈال دیے ”ٹھیک ہے میاں۔۔۔۔۔ اگر سب کی یہی مرضی ہے تو پھر میں اُسے معاف تو کر دوں گا لیکن صرف ایک شرط پر کہ وہ ولایت جا کر اپنی ادھوری تعلیم سب سے پہلے مکمل کرے۔۔۔۔۔ تب ہی میں اس کی شکل دیکھوں گا۔“ وقار تک یہ پیغام پہنچانے کا فریضہ خانم نے سجاد کے سپرد کر دیا اور ہم ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف ہو گئے۔ حمید کی غیر حاضری کے بارے میں نواب صاحب نے بتایا کہ وہ اپنے گھر والوں کو زمر دھولی کے پچھلے حصے میں بنی نیچر کی رہائش گاہ میں منتقل کروانے کے مقصد سے آج ہی شہر گیا ہے۔ حمید کے گھر والوں کی حویلی منتقلی کا سن کر فضلہ نے چونک کر میری جانب دیکھا، میں اُسے اس رات حمید اور شیخ صاحب کے تمام خاندان کے بارے میں تفصیل سے بتا چکا تھا اور اُسے گہنا کو دیکھنے کا شدید اشتیاق بھی تھا۔ خانم نے رنگا سے ناہید کے بارے میں بھی بہت بار پوچھا اور اصرار کیا کہ رنگا اُسے چند دن کے لیے زمر دھولی چھوڑ جائے تو کتنا اچھا ہو۔۔۔۔۔

تین دن پہلے جب میری کامیابی کا اعلان ہوا تھا اور میں اور سارا رنگا ناہید کی کٹھی پہنچے تو اس نے وہاں دن میں بھی چراغاں کر رکھا تھا۔ رنگا اپنی لاڈلی کے دیوانے پن پر مسکراتا رہا اور وہ بھاگ بھاگ کر اپنے بابا اور بھیا کی خدمت میں ہلکان ہوتی رہی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اگر میں بار جاتا تو پھر وہ کیا کرتی تو اُس نے رک کر اٹل یقین اور عزم سے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا ”آپ کو کبھی شکست نہیں ہو سکتی تھی آیان بھائی۔۔۔۔۔ یہ ایک بہن کا اُس کے خدا کے ساتھ معاملہ تھا۔۔۔۔۔ اور مجھے یہ یقین بھی اُسی خدا نے بخشا ہے کہ آپ کی فتح یقینی تھی۔“

رنگا نے خانم سے وعدہ کیا کہ وہ جلد ناہید کو حویلی بھجوادے گا۔ رات کے کھانے کے بعد ہم نے نواب صاحب سے رخصت طلب کی۔ وہ سب پور بچ تک ہمیں چھوڑنے کے لیے آئے اور گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے فضلہ نے دھیرے سے مجھے کہا ”تو گہنا جی یہاں آ رہی ہیں۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں کہ آپ کا خواب کیسا تھا۔۔۔۔۔؟“ میں نے پلٹ کر فضلہ کو دیکھا ”وہ میرا خواب ضرور تھی لیکن اُس خواب کی تعبیر میرا مقدر نہ بن سکی۔۔۔۔۔ کاش وہ خواب نہ ہوتی۔۔۔۔۔ صرف تعبیر ہوتی۔“ ہم یعقوب مینشن واپس پہنچے تو رات ڈھل چکی تھی، اگلے چند دن حکومت سازی اور جوڑ توڑ میں گزار گئے اور کامیاب ارکان کا باقاعدہ اعلامیہ جاری کر دیا گیا، موسیٰ بھی ہسپتال سے فارغ ہو کر دوبارہ مینشن آچکا تھا اور پھر ایک صبح ریحان اور ابا مجھے باقاعدہ لے جانے کے لیے مینشن آ گئے، ابا نے رنگا کی اُداسی دیکھ کر کہا۔ ”میں جانتا ہوں یہ آپ سب کے لیے بہت مشکل ہوگا لیکن آیان نے سب سے وعدہ کیا تھا کہ وہ چاہے حکومت میں بیٹھے یا چاہے مخالفت میں۔۔۔۔۔ لیکن وہ اپنا معاملہ نہیں چھوڑے گا۔“ رنگا نے ایک گہری سانس لی ”جی ماسٹر صاحب

..... مجھے سب یاد ہے..... لیکن یہ جاتے جاتے اس چار دیواری سمیت ہم سب کو ہمیشہ کے لیے اُداس کر جائے گا..... موسیٰ کو تو ابھی سے ہول اُٹھنے لگے ہیں.....“ لیکن وہ سب جانتے تھے کہ مجھے ایک نہ ایک دن یہاں سے جانا ہوگا۔ رنگا نے ابا سے درخواست کی کہ اس کی خواہش ہے کہ مجھے باقاعدہ اعزاز کے ساتھ یعقوب مینشن سے رخصت کیا جائے لہذا وہ ایک دن مزید صبر کر لیں، کل شام رنگا اور موسیٰ مجھے خود بابو محلے چھوڑ جائیں گے۔ ابا کے جانے کے بعد جب میرے جانے کی خبر پھیلی تو ان سب کے چہرے واقعی مُرجھا سے گئے اور رات تک میں ان سب کو یہی سمجھا تا رہا کہ میں چاہے یہاں رہوں یا چاہے اپنے گھر میں..... اب ہمارے درمیان جزا رشتہ موت بھی نہیں توڑ سکتی۔ اگلے دن صبح سے یعقوب مینشن میں مہمانوں کا تانتا بندھنے لگا۔ رنگا نے شائد سارے شہر کو ہی مدعو کر لیا تھا، اڈے کے پرانے ساتھی، سیاستدان، نوکر شاہی، پولیس، تاجر..... کون سا ایسا طبقہ تھا جو اُس شام رنگا کی دعوت میں مدعو نہیں تھا۔ شہر کے آئی۔ جی نے اس روز خاص طور پر یعقوب مینشن کی سیکورٹی پر پولیس کے افسروں اور نفری کی ڈیوٹی لگائی تھی، میں کسی کام سے گیٹ سے باہر نکلا تو مجھے ایک جانب اے ایس پی بلال کھڑا نظر آیا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے کھٹ سے سیوٹ کسا “آئی۔ جی صاحب نے کل سے میری ڈیوٹی آپ کے ساتھ لگا دی ہے۔ سنا ہے آپ نے سرکاری رہائش گاہ لینے سے انکار کر دیا ہے لہذا کل سے میری نفری آپ کے اپنے گھر کے باہر موجود ہوگی۔ آپ سے درخواست ہے کہ کہیں بھی جانے سے پہلے اپنا پروگرام اور شیڈول پولیس کو ضرور بجھوا دیا کریں.....“ میں نے بلال کو غور سے دیکھا “کیا صرف ایک الیکشن جیت لینے سے کوئی مجرم سے محرم بن جاتا ہے، “تم سے آپ“ کا سفر طے کر لیتا ہے.....؟“ بلال کو بھی شائد وہ دن یاد آ گیا جب اُس نے مجھے اسی اڈے کے ایک لڑکے سے لڑنے کے جرم میں حوالات میں بند کر رکھا تھا۔ بلال نے میرا اشارہ سمجھ لیا تھا۔ وہ سر جھکا کر بولا “سب نظام کی بات ہے آیان صاحب..... سچ تو یہ ہے کہ یہی نظام ہمیں محرم بھی بناتا ہے اور یہی مجرم.....“ میں نے بلال کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا “میرا مقصد تمہیں شرمندہ کرنا ہرگز نہیں تھا۔ بس یہ بتانا چاہتا تھا کہ میں آج بھی وہی آیان ہوں جو کل تھا، اور تم بھی آج مجھ سے ایک وعدہ کرو کہ نظام چاہے کتنا ہی زنگ آلود کیوں نہ ہو جائے، ہم سچ کوچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہنے کا حوصلہ سدا قائم رکھیں گے..... اور اس عمل میں مجھے تم ہمیشہ اپنی مدد کے لیے اپنے ساتھ کھڑا پاؤ گے.....“ بلال نے مسکرا کر میرا اس کے آگے پھیلا ہاتھ تھام لیا “ضرور.....“ مجھے چلتے چلتے کچھ یاد آیا۔ “اور ہاں..... مجھے سیکورٹی کی قطعاً ضرورت نہیں ہے..... جس دن مجھے اپنے علاقے اور اپنے لوگوں کے درمیان سیکورٹی کی ضرورت محسوس ہوئی، میں اُسی روز استعفیٰ دے دوں گا۔“

آخر کھانے کے بعد میرے الوداع کی گھڑی بھی آ گئی۔ میں فردا فردا اڈے کے ہر فرد سے گلے مل کر رخصت ہوتا رہا۔ یہ الوداع اس قدر اذیت ناک بھی ہو سکتے ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے پہلے کبھی نہ تھا۔ اسماعیل اور موسیٰ تو پہلے ہی احاطے کے دوسرے کونے میں جا کر اپنی بیگلی چلیں سب سے چھپا رہے تھے، رنگا سب کو سنبھالنے کی خاطر خود پر ضبط کیے کھڑا تھا لیکن مجھ میں بھلا اتنے ضبط کا یاد کہاں تھا..... میں آخری استاد سے مل کر تیزی سے پلٹا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتے ہوئے باہر کے احاطے میں کھڑی رنگا کی گاڑی میں جا کر بیٹھ گیا۔ وہ سب آخری گاڑی کے روانہ ہونے تک وہیں کھڑے ہاتھ ہلاتے رہے، دوسری جانب جب ہم بابو کالونی میں داخل ہوئے تو یکسر مختلف سماں تھا۔ سارے محلے میں میرے دوستوں نے چراغاں سا کر رکھا تھا۔ امی اور بابا نے چھوٹی اور ریحان سمیت گلی میں ہی میرا استقبال کیا۔ رنگا اور موسیٰ نے میرا کاندھا تھپتھپایا رنگا بولا “اچھا سا جن..... اب

چلتے ہیں۔ ماسٹر صاحب آپ کی امانت آپ کے سپرد ہے۔ دیکھ لو کوئی کمی بیشی تو نہیں ہے۔۔۔۔۔“ ابا ہنس پڑے ”آپ نے تو اس نالائق کو بیش قیمت بنا کر واپس کیا ہے۔۔۔۔۔ کی کا تو کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا۔۔۔۔۔“ رنگا اور موسیٰ نے بھاری دل کے ساتھ مجھے گلے لگایا۔ خود میرا دل بھی اندر سے کٹ رہا تھا۔ میں نے اسماعیل کی دل گرفتگی کم کرنے کے لیے وعدہ کیا کہ میں کم از کم ہر جمعرات کی شام اُن سب سے ملنے ضرور آیا کروں گا۔

رنگا اور موسیٰ نے جاتے جاتے بھی کئی بار مجھے گلے لگایا۔ ان کے پلٹتے ہی مجھے محلے والوں نے گھیر لیا اور مجھے اپنے گھر کے صحن میں قدم رکھتے رکھتے نصف شب ہو گئی۔ چھوٹی کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے وہ مجھ سے کوئی بہت ضروری بات کرنا چاہتی ہے، لیکن پہلے محلے والوں کے رش اور پھر صحن میں دیر تک ابا اور امی کی موجودگی کی وجہ سے اُسے یہ موقع بہت دیر سے ملا۔ اس کی آواز سرگوشی میں بدل گئی۔ ”بھائی۔۔۔۔۔ دو دن پہلے گہنا اور اُس کے گھر والے آئے تھے یہاں۔۔۔۔۔ آپ کی کامیابی کی مبارکباد دینے۔۔۔۔۔“ میں نے چونک کر چھوٹی کو دیکھا ”اور کون کون تھا۔۔۔۔۔“

”سبھی تھے، ستارہ، گہنا، ان کی امی اور ابا۔۔۔۔۔ وہ بتا رہے تھے کہ وہ لوگ اُسی دن زمر دھوپلی منتقل ہو رہے ہیں۔۔۔۔۔ اور ستارہ نے یہ بھی بتایا کہ تنویر بھائی نے مقابلے کا امتحان بڑے اچھے نمبروں سے پاس کر لیا ہے اور وہ جلد ٹریننگ کے لیے اکیڈمی جا رہے ہیں۔۔۔۔۔“ میں کچھ دیر خاموش رہا، اور پھر بولا تو خود میری اپنی آواز مجھے اجنبی لگی۔ ”چلو اچھا ہوا۔۔۔۔۔ تنویر کی محنت رنگ لائی“ میں چھت کی سیڑھیوں کی جانب بڑھنے لگا تو چھوٹی نے پھر مجھے روک لیا۔

”پوری بات تو سن لیں آیاں بھائی۔۔۔۔۔ گہنا جاتے جاتے آپ کے لیے پیغام دے گئی ہے کہ آپ ایک بار زمر دھوپلی آ کر اس سے ضرور مل لیں۔ وہ آپ کا انتظار کرے گی۔۔۔۔۔“ میں چونک سا گیا، اب گہنا کو مجھ سے بھلا کیا کام۔۔۔۔۔؟ شاید تنویر کی کامیابی کی خوش خبری خود مجھے اپنی زبانی سنانا چاہتی ہو۔۔۔۔۔؟ میں انہی سوچوں میں گم اوپر اپنے پرانے کمرے میں جا کر بستر پر پڑ گیا۔ ابا اور ریحان نے بہت کوشش کی تھی کہ میں نیچے برآمدے میں ریحان والا کمرہ لے لوں، لیکن میں نے انہیں بڑی مشکل سے یقین دلایا کہ مجھے اپنی پرانی شناسا دیواروں کے درمیان اور اُس مہربان چھت کے نیچے ہی سب سے اچھی نیند آئے گی، لیکن چھوٹی نے گہنا کا پیغام دے کر میری رہی سہی نیند بھی اڑا دی تھی، لہذا میں کھلے آسمان تلے آ کر لیٹ گیا اور پھر ساری رات میرے اپنے دوست تاروں کے ساتھ گلے شکوے چلتے رہے۔ وہ سب مجھ سے روٹھے روٹھے تھے کہ میں تو انہیں بھلا ہی بیٹھا تھا، میں نے انہیں بڑی مشکل سے منایا کہ میں بھلا کب اُن سے جدا ہوں۔۔۔۔۔ ہاں بس کچھ دن کے جوگ کی وجہ سے کچھ دور ضرور ہو گیا تھا، اور پھر اسی روٹھے منانے میں صبح ہو گئی، اور سب ستارے اگلی رات کے وعدے پر ماند پڑ گئے۔

آج میری نئی زندگی کی پہلی صبح تھی۔ ابا نے ریحان کو بھیج کر مجھے جلدی نیچے بلوایا۔ ناشتے کے بعد چھوٹی نے میرے بازو پر امام ضامن باندھا اور امی نے میرے سر پر قرآن کا سایہ کر کے مجھے گھر سے رخصت کیا۔ باہر لگی میں میرے مینوں دوست میرا انتظار کر رہے تھے، وہ میرے ساتھ بس اسٹاپ تک چلے آئے۔ مجھے اسبلی جانے والی روٹ کی بس کا انتظار تھا، اس دن سفر کرنے والے کم اور میرے ساتھ جانے والے لوگ زیادہ تھے۔ بس حسب معمول اپنے وقت سے پندرہ منٹ لیٹ پہنچی، اور مشی نے اپنی کاپی میں درج کر لیا ”بس کے اوقات درست ہونے چاہئیں۔۔۔۔۔“ بس میں ہمیشہ کی طرح شدید بھڑ اور خواتین والے حصے میں بھی مرد گھسے ہوئے تھے۔ کاپی میں درج ہو گیا۔ ”ٹرانسپورٹ کی حالت زار۔۔۔۔۔“ اور یوں

اسہلی تک پہنچتے پہنچتے وہ تینوں وہ سب درج کرتے گئے جس کو دیکھ دیکھ کر ہم بچپن سے کڑھتے آئے تھے، صفائی، ٹریفک، سگنل، تیز رفتاری، زیرِ پا کرا سنگ کی کمی، بوڑھوں اور بزرگوں کے لیے سڑک پار کرنے کے لیے میٹرجمی والے پل اور وہ سب کچھ جو میرے حلقے میں بد نظمی کا شکار تھا۔ اسہلی کے اندر وہی مردہ ماحول تھا، ادھگھٹتے ہوئے وزیر اور بے زار سے اسٹیکر اور ڈپٹی سپیکر، وقت گزاری کی خاطر آنے والی اور تماشوں کی منتظر پوزیشن اور نوکر شاہی کے ٹالنے والے جوابات، پہلے دن تو اسہلی کو دیکھ کر مجھے اپنے پرائمری اسکول کی جماعت یاد آگئی جہاں بیٹھے ہی ہمیں گھر واپسی کی فکر پڑ جاتی تھی اور ہم کسی نہ کسی طرح اسکول کا وقت بے زاری بے دلی اور انگڑائیاں لیتے ہوئے سر سے اُتار کر پھینکنے کے انداز میں گزار کر فوراً گھر بھاگنے کی کیا کرتے تھے۔ واپسی کی بس پر پھر وہی معمول دہرایا گیا اور گھر پہنچ کر میں نے کچھ آرام کے بعد امی سے بجلی کا تازہ بل لانے کو کہا۔ کچھ دیر بعد میں محلے کی بیرونی سڑک پر لگی لمبی قطار میں بل جمع کروانے کے لیے کھڑا تھا۔ ان سب نے مجھے قطار میں اپنی اگلی جگہ کی پیشکش کی لیکن میرا مقصد تو خود کو انہی جیسا ثابت کرنا ہی تو تھا، سو میں مسکراتا ہوا اپنی جگہ پر کھڑا ہا، شام کی چائے ہم سب دوستوں نے کیفے فراق میں ہی پی اور وہیں مرزا کے کمرے کو میں نے اپنا دفتر بنانے کا اعلان بھی کر دیا۔ پہلے دن ہی میرے پاس قریباً دو درجن درخواستیں جمع کرائی گئیں۔ میرے حلقے کے مسائل بھی میرے گھر کے مسائل کی طرح معصوم اور چھوٹے چھوٹے سے تھے، کسی کی بجلی کا بل زیادہ آ یا تھا تو کسی کا بل جمع کروانے کے باوجود بھی میٹر کٹ گیا تھا۔ کسی کی گیس آتی ہی نہیں تھی اور کسی کے کنکشن کا لکچ سال بھر سے بند نہیں ہوا تھا۔ کسی کے بچے کو سرکاری اسکول سے لمبی غیر حاضری پر نکال دیا گیا تھا اور کوئی اسکول کے دروازے سے اندر ہی داخل نہیں ہوا تھا کہیں سڑک بن کر ٹوٹی تھی اور کہیں ٹوٹی سڑک پر ہی بجزی ریت ڈال کر بھر دیا گیا تھا۔ کسی کو پولیس صرف شک کی بنیاد پر اٹھا لے گئی تھی اور کوئی پولیس کے سامنے دہائیاں دے دے کر تھک گیا تھا مگر اس کی داد دے نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے منشی، بالے اور راجہ کو مختلف جگہ بانٹ دیے اور مرزا کو اپنا سیکرٹری مقرر کر دیا چچا فراق نے ہمارے منتظم اعلیٰ کی ذمہ داریاں سنبھال لیں اور یہ سب کچھ بناؤ کسی تنخواہ یا معاوضے کے طے ہوا۔ وہ سب جانتے تھے کہ اس وقت مجھے ان سب کی کتنی ضرورت ہے اور میرے ساتھ قابل اعتماد ساتھیوں کا ہونا کس قدر اہم ہے۔ سارا نگا میری اس نئی چوار کا ناخدا اور موکی کھے دیا ٹھہرا۔ یعقوب مینشن ہمارا ہیڈ کوارٹر تھا جہاں اب رنگا اور موکی سارا دن لوگوں کے مسئلے سنتے اور انہیں طاقت کے بجائے سیاست سے حل کرنے کی کوشش کرتے تھے، میں نے دوسرے روز ہی آئی۔ جی سے مل کر اپنے علاقے کی پولیس میں چند ضروری تبدیلیوں کی درخواست کی جنہیں کمال شفقت سے اُسی وقت تسلیم کر لیا گیا اور حاکموں کی جگہ مددگار طبیعت عملہ تعینات کر دیا گیا۔ بلال کا ساتھ اب بھی مجھے حاصل تھا۔ میں نے منشی، بالے اور راجہ کے والدین سے پہلے روز ہی ان تینوں کو اپنی ٹیم میں شامل کرنے کی اجازت طلب کر لی تھی۔ بالے کے ابا مسکرا کر بولے تھے ”ہم منع بھی کریں گے تو یہ نالائق ہماری بات تھوڑی مانیں گے۔۔۔۔۔۔ لیکن اس بار ہم سب اپنے دل کی گہرائیوں سے انہیں اجازت دیتے ہیں کہ وہ تمہارے ساتھ مل کر اس علاقے کی تقدیر بدل دیں۔ اب ہم بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں اپنے بچوں پر فخر ہے۔۔۔۔۔۔“

اور پھر تین چار دن بعد جب یہ ساری خبریں ریڈیو، ٹی وی اور اخبار والوں کو پتہ چلنے لگیں اور ان کے رپورٹر اور کمرہ میرے ساتھ ساتھ گھومنے لگا تو واقعی اگلے چوبیس گھنٹوں میں سب بدلنے لگا۔ سرکاری بس ٹھیک اپنے وقت پر آنے لگی۔ میونسپل کا عہدہ صبح سویرے اپنی ڈیوٹی پر پہنچنے لگا۔ علاقے کی دیواروں پر قلعی اور سڑکوں پر پرنی زیرِ پا کرا سنگ جگمگانے لگی۔ اسکول وقت پر لگے اور دفتر کا عملہ وقت پر چھٹی کرنے لگا، بل درست ہونے

لگے اور نظاریں گھٹنے لگیں۔ بجلی اب بھی جاتی تھی مگر مقررہ وقت پر، پانی اب بھی کم آتا تھا، مگر روز آنے لگا تھا۔ گوالا اب بھی ملاوٹ کرتا تھا مگر اب اس نے پانی میں دودھ کے بجائے دودھ میں پانی ملانا شروع کر دیا تھا۔ غرض ہر بگڑی چیز نے درست ہونے کے لیے ایک انگریزی ضروری تھی۔ ابا کے بقول یہ ساری تبدیلی صرف اس وجہ سے ہو پائی تھی کیونکہ میں نے اپنے علاقے سے ناٹھ نہیں توڑا تھا۔ ورنہ یہی سارے مجھے اپنا سارا زور صرف میرے سرکاری گھر کو سدھارنے میں لگا دیتے۔ میرے نوجوان کارکن اور ساتھی اب بھی ہر قدم پر میرے ساتھ تھے اور ہم ہر دوسرے تیسرے دن ریگل یا صدر کے علاقے میں اپنی میٹنگز منعقد کر کے آگے کا لائحہ عمل طے کرتے رہتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کو اس کی استعداد اور خصوصیت کے مطابق کام بانٹ دیا گیا تھا اور میں نے ان کے معاوضے کا منصوبہ بھی حکام بالا کو پیش کر دیا تھا کہ لاکھوں کروڑوں کے فنڈ نمائندوں میں بے کار بانٹ دینے کے بجائے اگر اسی رقم کو ہر علاقے کے بے روزگار نوجوانوں کے ہنر کو اجاگر کرنے میں خرچ کیا جائے تو ہم چند سالوں میں ہی اس ملک کی تقدیر بدل سکتے ہیں۔ ان نوجوانوں نے میرے حلقے کی ہر گلی، ہر سڑک کا انتظام سنبھال لیا تھا اور یہ انہی کی کوششوں کا ثمر تھا کہ شہر کے سب سے بڑے اخبار نے دوسرے ہفتے ہی ہمارے علاقے کے بارے میں اپنے اخبار میں شہر سرفہرشی جہائی۔

”نوجوان انقلاب.....“

اس تمام عرصے میں مجھے ایک بات کا شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ ہم اگر تبدیلی چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے گھر اور گلی سے ابتداء کرنی ہو گی۔ گھر، گلی، محلہ، سڑک، یونین کونسل، شہر، ضلع، صوبہ اور پھر ملک..... یہ ترتیب رہے گی تبھی ہم اپنی منزل تک پہنچ سکیں گے ورنہ سدا بھٹکتے رہیں گے۔ خود کو تبدیل کیے بناء نظام کو بدلنے کی باتیں صرف ایک دھوکہ اور سراب ہوتی ہیں اور ہم شاید سدا سے ہی سراپوں کے پیچھے بھاگتے آئے ہیں۔

لیکن ہم سب نے مل کر اس سراپ کو خواب اور پھر اس خواب کو ایک حقیقت میں بدلنے کا فیصلہ کر لیا تھا، دن، ہفتوں میں اور پھر چار ہفتے ایک مہینے میں بدل گئے، میں روز زمر دھوپیلی کی طرف جانے کا سوچتا اور روز کسی نہ کسی کام میں پھنس کر رہ جاتا۔ آخر ٹھیک ایک مہینے بعد نواب صاحب کی گاڑی خود مجھے لینے آ پہنچی، اسماعیل نے بتایا کہ نواب صاحب نے رنگا موسیٰ اور مجھے دعوت پر بلایا ہے اور سختی سے تاکید کی ہے کہ اگر اس بار میں نے غیر حاضری کی تو وہ باقاعدہ ناراض ہو جائیں گے۔ اب میرے پاس کوئی بہانہ نہیں بچا تھا، اور پھر ہم سب اسی شام دو گاڑیوں میں زمر دھوپیلی کے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہو رہے تھے۔ رنگا مجھے راستے میں ہی بتا چکا تھا کہ اس نے خانم کی درخواست پر ناہید کو کچھ دن کے لیے زمر دھوپیلی بھجوا دیا ہے۔



باب 34

اور پھر حویلی میں داخل ہوتے ہی میری پہلی نظر ناہید ہی پر پڑی جو باہر دالان میں ہی موجود تھی، لیکن وہ مجھ سے بہت ناراض تھی اور اس نے باقاعدہ اعلان کر دیا کہ اب وہ مجھ سے کبھی بات کرے گی جب میں یہ وعدہ کر لوں کہ کم از کم دو دن زمر حویلی سے باہر قدم بھی نہیں رکھوں گا، رنگا اور موسیٰ نے بھی میری معاونت سے انکار کر دیا اور مجبوراً مجھے ہاں کرنی ہی پڑی۔ خانم نے مردانے اور زنانے کے انتظامات خوب سنبھال رکھے تھے اور فضا ان کی مدد میں جٹی ہوئی تھی۔ ایک آدھ بار مردانے میں آتے جاتے اور ملازموں کو ہدایات دیتے حمید پر بھی میری نظر پڑی۔ جانے شیخ صاحب اور ان کے گھر والے یہاں حویلی میں دل لگا پائے تھے یا نہیں.....؟ نئی جگہ کے اپنے مسائل اور نت نئے دوسرے ہوتے ہیں، پھر چاہے وہ زمر حویلی جیسا محل ہی کیوں نہ ہو، نئے مکینوں کو اپنی پرانی کنیا کی یاد بھی ضرور آتی ہوگی لیکن میں چاہ کر بھی نواب صاحب یا فضا سے گہنا یا شیخ صاحب کے گھر والوں کی خیریت نہ پوچھ سکا، شاید میرے ہی دل کا کوئی چور تھا جو مجھے یہ سوال کرنے سے روکتا رہا۔ دل کے کھٹکے یوں تو سدا بے آواز ہوتے ہیں، لیکن ہر آہٹ پر یہ دل کے اندر بڑا شور مچاتے ہیں۔ ہاں مگر باہر والوں کو یہ شور کبھی سنائی نہیں دیتا۔

میرے اندر کا شور بھی بس خود مجھی کو سنائی دے رہا تھا، اور جب انسان کے اپنے اندر اتنا شور ہو تو اُسے باہر کی باتیں ذرا کم ہی سنائی دیتی ہیں۔ مجھے بھی اس رات کھانے کی میز پر سب کے درمیان ہوتی گفتگو کا کچھ پتہ نہیں چلا، اور ان سب کا ساتھ دینے کے لیے میں بس ہوں ہاں کرتا رہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ فضا میری اس کیفیت کو بھانپ چکی ہے اور کئی بار جب میں نے نظر اٹھائی تو میں نے اُسے اپنی جانب ہی دیکھتے ہوئے پایا۔ کھانے کے بعد ایرانی قبوے کی فرمائش کی گئی اور پھر سبھی باہر دالان میں چہل قدمی کرنے کے لیے ادھر ادھر ٹولیوں میں بٹ گئے۔ میں چپ چاپ بہتہ نہر کے کنارے آ کر بیٹھ گیا۔ فضا نے اپنی نگرانی میں سنگ مرمر منگوا کر نہر کے کنارے بہت سی مزید سنگ مرمر کی شفاف سلیں بیچوں کی صورت میں بچھو ادیں تھیں اور نظر کو دور تک بہت بھلا منظر محسوس ہوتا تھا۔ ان سلوں کی ساخت بھی راج ہنسوں کے تیرتے ہوئے جوڑوں کی طرز پر بنائی گئی تھی اور دور سے بہت سے راج ہنس نہر کے پانی پر پیراکی کرتے، بہتے نظر آتے تھے، لیکن کچھ ہنس ایسے بھی تو ہوتے ہیں جن کی کوئی راج ہنسی نہیں ہوتی۔ میں اُس ماحول میں وہی ایک اکیلا اور جدا راج ہنس تھا ”یہاں تنہا کیوں بیٹھے ہیں آپ.....؟“ میں چونک کر پلٹا فضا جانے کب سے میرے عقب میں کھڑی تھی ”بہت لمبی محفل کے بعد ذرا دیر کی تنہائی اچھی لگتی ہے.....“ فضا نے غور سے میری جانب دیکھا ”واقعی..... لیکن کیا صرف اتنی ہی بات ہے.....؟ کہیں آپ خود سے بھی تو نہیں چھپ رہے.....“ میں نے مسکرا کر اس بے اعتبار کی جانب دیکھا ”گویا آپ نے چہرے پڑھنا بھی سیکھ لیا ہے فضا جی.....“ وہ بھی مسکرا دی ”نہیں..... چہرہ شناسی کا دعویٰ تو کبھی نہیں رہا مجھے..... بس یونہی ایک خیال سا آ گیا تھا..... ویسے آپ کی نگاہ کی داد نہ دینا بھی بہت زیادتی ہوگی۔ وہ واقعی چاہے جانے کے قابل ہے..... ہزاروں میں بھی گھری ہو تو قبل بھر میں ساری توجہ اپنی جانب مبذول کروا لینے والی..... میری بہت لمبی ملاقاتیں ہوئی ہیں اس کے ساتھ اس ایک ڈیڑھ ماہ کے دوران.....“ میرا دل زور سے دھڑکا۔ یہ کم بخت دل ہمیشہ پرانے

کھلونے دیکھ کر ہی کیوں مچلتا ہے۔ میرا دل چاہا کہ فضا سے اس کی بہت سی باتیں کروں لیکن میں نے بڑی مشکل سے خود پر جبر کیا۔ فضا میری حالت سے بے خبر اپنی اور گہنا کی ملاقاتوں کی تفصیل بتاتی رہی۔ درمیان میں کہیں کہیں ستارہ کی نفاست اور سلیقے کا ذکر بھی آیا۔ میں نے فضا کو بتایا کہ گہنا نے یہاں آنے سے پہلے چھوٹی کو ہمارے گھر آ کر میرے لیے کیا پیغام دیا تھا۔ فضا کی آواز کچھ لرزی گئی ”اچھا..... تو وہ آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہے..... ٹھیک ہے میں کل..... آپ دونوں کی ملاقات کا بندوبست کروانے کی کوشش کروں گی.....“ فضا میری الجھن سلجھانے میں کھو کر خود کچھ الجھی گئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ یونہی الجھی الجھی سی مجھ سے رخصت لے کر اپنے کمرے کی جانب چلی گئی اور میں بھی واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

صبح شیخ صاحب سے بھی حویلی کے بیرونی احاطے میں ملاقات ہو گئی، اور میں کچھ دیر کے لیے ان کے ساتھ عقبی احاطے میں موجود ان کی رہائش گاہ تک چلا آیا۔ شیخانی جی کا دل تو نئی جگہ میں خوب لگ گیا تھا۔ ستارہ سلام کر کے مسکراتے ہوئے بولی ”لگتا ہے آپ نے ہمیں بالکل ہی بھلا دیا ہے..... بس آپ کے قصے سننے کو ملتے ہیں..... اخباروں میں بڑا چرچا ہے آج کل آپ کے اس نوجوان انقلاب کا.....“ میں اُسے جواب دینے ہی لگا تھا کہ اچانک گہنا کمرے میں داخل ہوئی اور اُس نے مجھے سلام کر کے دھیرے سے کہا ”بہت دن لگا دیے آپ نے یہاں آنے میں.....“ مجھ سے کچھ کہا نہیں گیا۔ یہ وہ گہنا تو نہیں تھی جسے میں ہمیشہ سے جانتا تھا۔ یہ تو زردی مائل چہرہ اور آنکھوں میں اداسی کے گہرے سیاہ ڈورے لیے، خاموش اور کھوئی کھوئی سے کوئی اور لڑکی تھی۔ میں جس گہنا کو جانتا تھا اس کے چہرے کا کھال تو سرمئی شام کو بھی گلابی کر دیتا تھا، جس کی آنکھوں کا کاجل بھری دھوپ میں بھی اندھیرا کر سکتا تھا اور جس کی گھنی پلکوں کی چھاؤں اور دھانی آنچل کا سایہ صحران کو بھی ٹھنکاتا کر دیتا تھا.....

لیکن یہ گہنا تو کوئی اور ہی تھی۔ جیسے خود برسوں سے کڑی تپتی دھوپ میں کھڑی ہو۔ مجھے بہت حیرت ہوئی کیونکہ اب تو تویر بھی سی ایس پی افسر بن چکا تھا۔ اب کیا پریشانی لاحق تھی اُس گفٹام کو..... کہ اس کا پھول سا چہرہ یوں کھلا گیا تھا۔ مجھ سے زیادہ دیر تک وہاں بیٹھنا نہ گیا اور میں جلد شیخ صاحب سے رخصت لے کر وہاں سے چلا آیا۔

سہ پہر کو خانم سے ایک لمبی نشست رہی اور وہ بہت دیر تک مجھ سے میرے مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں پوچھتی رہیں۔ اُن کے انداز میں تحسین سے زیادہ خوشی کا عنصر واضح تھا اور انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ جب وہ تہران یونیورسٹی کی طالبہ تھیں تو پولیٹیکل سائنس Political Scienc ان کا پسندیدہ مضمون تھا۔ شام کی چائے پر مجھے فضا دکھائی نہیں دی۔ شاندار خلوص لڑکی اپنا وعدہ نبھانے کے جتن میں جتنی ہوئی تھی۔ اس نے آج میری گہنا سے ملاقات کروانے کا وعدہ کیا تھا کیونکہ کل ہمیں واپس لوٹ جانا تھا۔ رات کے کھانے پر مجھے فضا کی ایک جھلک دکھائی دی مگر وہ دشمن کے ساتھ مہمانوں کی تواضع میں مصروف رہی۔ دس بجے کے بعد ہم سب اپنے اپنے کمروں کی جانب لوٹ گئے۔ مجھے ایک عجیب طرح کی بے چینی نے آ گھیرا تھا۔ جیسے ہمیشہ کسی انہونی سے قبل میرے حواس معطل سے ہونے لگتے تھے۔ میں نے گھبراہٹ دور کرنے کے لیے کمرے میں رکھی کتابوں میں سے ایک اٹھالی اور یونہی ورق گردانی کرنے لگا۔ اچانک دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ میں چونک گیا۔ باہر دشمن کھڑا تھا ”چلیں میاں..... آپ کو فضا بی بی نہر کنارے یاد کرتی ہیں.....“ دشمن کے رازدارانہ انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ بھی فضا کے تمام رازوں میں برابر کا شریک ہے۔ میں دشمن کی سربراہی میں نہر کے قریب پہنچا تو وہ راستے ہی سے پلٹ گیا۔ آخری دنوں کے چاند کی مدہم روشنی میں مجھے سنگ مرمر کے شیشے کے

قریب کوئی کھڑا نظر آیا۔ شائد وہ فضاء کا بیولا تھا۔ میں نے قریب پہنچ کر دھیرے سے کھنکارا ہیولے نے پلٹ کر دیکھا۔ لیکن..... وہ تو گہنا تھی، ویسے ہی دن کی طرح گہنائی ہوئی..... کچھ دیر کے لیے میں سب کچھ بھول گیا، وہ مجھے اور میں اُسے دیکھتا رہا..... ”آپ..... یہاں..... اس وقت.....؟“..... گہنا بھی سنبھل گئی ”جی..... ابھی چند لمے پہلے فضاء مجھے یہاں چھوڑ گئی ہیں..... آپ نے مجھ سے ملنے کے لیے وقت نکالا..... میں شکر گزار ہوں آپ کی.....“ میں ہڑسا گیا ”ایسا کیوں کہہ رہی ہیں آپ..... آپ سے ملاقات میرے لیے ہمیشہ ایک خوشگوار تجربہ رہا ہے.....“ میرا جی چاہا کہ میں اس سے کہوں کبھی میری پوری زندگی کا مقصد ہی صرف ایسی ایک ملاقات ہی تو تھا۔ اُس نے اصرار کیا ”نہیں..... پہلے کی بات اور تھی لیکن میں جانتی ہوں کہ اب آپ کی مصروفیات بہت بڑھ گئی ہیں.....“ میں مسکرا دیا ”انسان کتنا بھی مصروف کیوں نہ ہو اُسے اپنے گھر آنے کے لیے کسی بہانے کی ضرورت نہیں ہوتی، یہ حویلی بھی میرا گھر ہی تو ہے، نہ صرف یہ بلکہ یعقوب مینشن اور ناہید کی کوٹھی بھی..... سبھی میرے اپنے گھر ہیں۔ کبھی کبھی تو میں سوچتا ہوں کہ ابانے مجھے گھر سے نکال کر اچھا ہی کیا تھا۔ نہ وہ مجھے گھر سے نکالتے نہ میرے اتنے بہت سے آشیانے بنتے.....“

گہنا اب بھی کچھ گم سم سی تھی ”آپ واقعی بہت خوش قسمت ہیں..... سب کچھ کر بھی اس سے دو گنا پالیا آپ نے..... ورنہ یہاں تو ایسے بھی کچھ سیانہ نصیب ہیں جو سب پا کر اپنے ہاتھ سے کھودیتے ہیں۔“

میں نے چونک کر گہنا کی طرف دیکھا ”آپ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں۔ سب ٹھیک تو ہے نا..... تصویر کی کوئی خیر خبر آئی اکیڈمی سے..... معافی چاہتا ہوں میں تصویر کی کامیابی کی مبارک باد دینے نہیں آ سکا وقت پر.....“

گہنا نے زخمی نظر سے میری جانب دیکھا ”وہ ٹھیک ہیں..... ابھی کل ہی ان کا ابا کے نام خط آیا تھا۔ انہوں نے ستارہ آپ کی کا ہاتھ مانگا ہے ابا سے.....“ میرے اندر ایک زوردار چھٹا کے کی آواز کے ساتھ بہت کچھ ٹوٹ گیا۔

”کیا.....؟..... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں..... تصویر نے ستارہ کا ہاتھ مانگا ہے..... مگر.....؟..... لیکن.....“ مجھے سمجھ نہیں آیا کہ میں آگے کیا کہوں، لیکن گہنا کے چہرے پر کچھ اور بے چینی تھی۔

”جی..... تصویر بھائی تو ستارہ آپ کی پہلی شادی سے بھی قبل ان کے امیدوار تھے..... لیکن تب وہ بے روزگار تھے اور ابانے اچھا رشتہ آنے پر آپ کی کو بیہ دیا تھا۔ آپ کی بیوی کے بعد بھی تصویر بھائی کے دل میں ستارہ آپ کی ہی بہتی ہیں۔ تصویر بھائی نے میرے کہنے پر ہی مقابلے کا امتحان دیا تھا کیونکہ میں جانتی تھی کہ حمید بھائی اس کے بعد ان کے رشتے کو ”ناں“ نہیں کہہ پائیں گے۔ آپ کیا سمجھتے تھے کہ تصویر بھائی میری خاطر اتنی محنت کر رہے ہیں.....؟“

”جی..... سچ تو یہی ہے کہ میں نے جب آپ کے مستقبل کے ہم سفر کے بارے میں خیالات سنے تو مجھے تصویر ہی اس خاکے پر پورا اترتا نظر آیا تھا، لیکن خود ستارہ نے بھی تو کبھی ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا.....“

”وہ کبھی اپنی زبان سے تصویر بھائی کی چاہت کا اقرار نہیں کریں گی۔ وہ تو تب بھی نہیں بولیں تھیں جب ابانے ان کا ہاتھ کسی اور کے ہاتھ میں دے دیا تھا.....“ گہنا کی باتیں سن کر میرے اندر کا شور بڑھتا جا رہا تھا، گہنا نے اپنی بات جاری رکھی ”ہاں..... البتہ ایک وقت ایسا ضرور آیا تھا

جب تنویر بھائی کے ساتھ میری بے تکلفی دیکھ کر خود ستارہ آپنی اس غلط فہمی کا شکار ہو گئی تھیں کہ شائد ان کی شادی کے بعد میں خود تنویر بھائی کی زندگی کا حصہ بن چکی ہوں، لیکن میری اور تنویر بھائی کی وہ گھنٹوں باتیں اور وہ چپچپ کر کھسک پھسک بھی ستارہ آپنی کو دوبارہ ان کی زندگی میں لانے کے لیے ہی ہوتی تھی۔ تنویر بھائی کی خواہش پر ہی یہ بات ان کے سی۔ ایس۔ ایس (CSS) کے امتحان کا نتیجہ نکلنے تک پوشیدہ رکھی گئی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ایک بار وہ یہ معرکہ سر کر لیں تبھی وہ ستارہ آپنی اور ہمارے گھر والوں کے سامنے اس رشتے کی پیش کش رکھیں گے۔۔۔۔۔ کیونکہ ایک بار پہلے بھی بے روزگاری کی وجہ سے حمید بھائی ان کا ستارہ آپنی کے لیے آیا ہوا رشتہ سختی سے ٹھکرا چکے تھے، اور تنویر بھائی صرف ایک جونیئر انجینئر کی نوکری کے بل پر دوبارہ یہ پروپوزل نہیں بھیجنا چاہتے تھے کیونکہ ان کی انجینئر کی نوکری بھی عارضی تھی۔۔۔۔۔ گہنا کی باتیں سن کر بل بھر میں میرے سامنے اب تک تنویر سے ہوئی کبھی ملاقاتیں ایک جھماکے کی صورت میں چلیں۔۔۔۔۔ اوہ۔۔۔۔۔ تو اُس کا والد البانہ پن اور مقابلے کا امتحان پاس کرنے کا وہ جنون ستارہ کی خاطر تھا، لیکن میری بہت سی الجھنیں ابھی باقی تھیں۔

”لیکن آپ خود بھی تو ہمیشہ سے ایک منظم زندگی اور افسرانہ انداز کی شیدائی رہی ہیں۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ یہ درست ہے کہ مجھے سی ایس پی افسر اور اُن کی زندگی کا ایک منظم انداز بہت پسند ہے۔۔۔۔۔ میں لڑکا ہوتی تو خود بھی ایسا ہی کوئی کیریئر چنتی یا پھر فوج میں کمیشن لے لیتی۔۔۔۔۔ بچپن سے میرے خوابوں کا شہزادہ ایسا ہی کوئی افسر رہا ہے۔۔۔۔۔ اور یہ بات ہمارے گھر میں کسی سے بھی پوشیدہ نہیں ہے۔۔۔۔۔ بلکہ جب میں دسویں میں تھی اور امی نے ایک دن مجھے ڈانٹ کر یونہی کہہ دیا تھا کہ اگر میں نے گھر کا کام ٹھیک سے نہیں کیا تو وہ مجھے کسی کلرک کے ساتھ بیاہ دیں گی تو میں باقاعدہ روپڑی تھی اور دو دن تک میرے آنسو بات بے بات ٹپک جاتے تھے، پھر خدا خدا کر کے پورے گھر نے میرے سامنے ہاتھ جوڑے تھے تب کہیں جا کر میں چپ ہوئی تھی۔۔۔۔۔ اسی لیے جب آپ سے میری ملاقات ہوئی تھی تو آپ صرف ایک اچھے انسان اور دوست لگے تھے، اور میں چاہتی تھی کہ ایک اچھا دوست اپنی زندگی کو یوں غیر منظم انداز میں گزار کر ضائع نہ کرے بلکہ خود کو کسی باقاعدہ اور سنجیدہ طرز حیات میں ڈھال کر اپنی صلاحیتیں بروئے کار لائے۔۔۔۔۔ لیکن تب کبھی میں نے آپ کے لیے اس سے سوا کچھ نہیں سوچا۔۔۔۔۔ کچھ نہیں چاہا۔۔۔۔۔ مگر جب آپ کی غیر حاضری کے وقفے طویل ہونے لگے تو نہ جانے کیوں مجھے آپ یاد آنے لگے، آپ کی شرارت آمیز باتیں، آپ کا وہ زندگی کو ایک پل میں جی لینے کا نظریہ اور وقت کو اپنے قابو میں کرنے کے بجائے خود کو وقت کے دھارے پر چھوڑے رکھنا۔۔۔۔۔ یہ سب اندر ہی اندر مجھے بھانے لگا۔۔۔۔۔ لیکن اس وقت میں خود اپنے اندر ہوتی اس تبدیلی سے انجان تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ محبت کسی نظم و ضبط یا ڈسپلن کی پابند نہیں ہوتی، محبت اپنا ڈسپلن خود قائم کرتی ہے۔۔۔۔۔ چاہے اس قیام کے لیے وہ دوسروں کے دلوں کا ہر نظم لپیٹ کر دے، ہر ضبط کو کسی تیز آندھی اور طوفان کی طرح اکھاڑ پھینکے۔۔۔۔۔ محبت ایک دھیمے طوفان کی طرح ہمارے دل کے کواڑوں پر دستک دیتی ہے لیکن ایک بار وہ دل کے درپچوں سے اندر گھس جائے تو پھر اس تیز آندھی کے سامنے ہمارے تمام اصول، تمام قاعدے اور بندھن خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتے ہیں۔ جب مجھے ستارہ آپنی نے آپ کے دل میں میرے لیے پلٹے جذبے کے بارے میں بتایا تو ٹھیک یہی سب کچھ میرے ساتھ بھی ہوا۔ میرے تمام اصول، میرے تمام معیار اپنی جگہ موجود رہتے ہوئے بھی بے معنی سے ہوتے چلے گئے۔ شروع شروع میں تو مجھے خود پر بھی بہت غصہ آتا تھا کہ یہ مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔۔۔۔۔ لیکن تب مجھ پر ایک اور

راز آشکارا ہوا کہ ضروری نہیں کہ ہم عمر بھر جس معیار کو اپنے دل میں سجائے بیٹھے ہوں، صرف اس پر پورا اترتا کوئی شخص ہی ہماری محبت بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ اس معیار اور اُن خوابوں کی تعبیر ہمارے دل میں ہمیشہ پلنے کے باوجود کوئی بالکل مخالف سمت کا انسان بھی ہمارے دل کے سنگھاسن پر آ کر براجمان ہو سکتا ہے۔ یعنی ہم اپنے آئیڈیل اور معیار کی ساری عمر عزت تو کر سکتے ہیں..... لیکن کبھی کبھی محبت کی تعبیر کسی اور کی صورت ہمارے دل میں وارد ہو جاتی ہے۔ ٹھیک یہی حادثہ میرے ساتھ بھی ہوا۔ میرا آئیڈیل آج بھی میرے اندر کسی محترم شخصیت کی طرح چلتا ہے..... لیکن وہ میری محبت نہیں بن سکا آیان..... میں اپنے دل کے آئیڈیل کی ہمیشہ عزت کرتی رہوں گی لیکن میں محبت آپ سے.....“ گہنا روانی میں کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ وہ سر جھکائے میرے سامنے کھڑی تھی اور اس کا وجود کانپ رہا تھا۔ جیسے وہ صدیوں کی مسافت طے کر کے یہاں تک پہنچی ہو۔ کچھ دیر ہم دونوں ہی خاموش رہے۔

”میں جانتی ہوں میں نے اپنے دل کے جذبیوں کو سمجھنے میں بہت دیر کر دی ہے، آپ کی زندگی میں اب کچھ اور لوگ بھی ہیں جو شاید مجھ سے زیادہ محرم اور محترم ہوں گے آپ کے لیے..... لیکن اگر میں آپ کو یہ سب کچھ نہ بتاتی تو عمر بھر یہ خلش مجھے بے چین کیے رکھتی.....“ وہ شائد فضا کی بات کر رہی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کچھ کہوں یا بس اُسی کو سنتا رہوں۔ میرے پاس کہنے کو کچھ باقی ہی کب تھا بھلا.....؟؟ گہنا نے اپنی بات جاری رکھی۔

”کتنی عجیب بات ہے کہ جس وقت میرا دل اپنے سارے اصول قاعدے اور معیار بھلا کر آپ کے حق میں میرے من کو استوار کر رہا تھا اور مجھے آپ کی محبت کے دلائل سے لاجواب کر رہا تھا، ٹھیک اُسی وقت فضا یہاں اس حویلی میں آپ کو وہ تمام قاعدے اور نظم و ضبط سیکھا رہی تھیں جو میرے آئیڈیل کا تقاضہ تھے۔ انہوں نے آپ کو زندگی کا ڈسپلن سکھا کر کامیابی کی راہ پر گامزن کر دیا اور میرے دل نے میرے اندر کارڈ ڈسپلن اور قاعدہ توڑ ڈالا..... میں اُس لاابالی۔ کھلنڈرے اور بھنگڑا لوانو کا انتظار کرتی رہی اور میرے سامنے ایک بدلا ہوا، بنجیدہ اور پردہ بادیان آ گیا۔ وہ آیان..... جس کی زندگی اب کسی اور کی محبت کی مقروض تھی۔ فضا نے پہلے روز ہی مجھ پر اپنے دل کی حالت کھول دی تھی، اور یہ بھی ان کی سادہ دلی اور صاف گوئی کی ایک مثال ہے..... مجھے انہیں اپنے اندر کی بات بتانے کا وقت ہی نہیں دیا قدرت نے..... شاید میں انہیں پہلے بتا دیتی تو وہ اتنی اعلیٰ ظرف ہیں کہ کبھی مجھ سے اپنی محبت کا ذکر نہ کرتیں..... لیکن مقدر نے انہیں یہ موقع پہلے دے کر اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا تھا، اور سچ تو یہ ہے کہ مجھ سے زیادہ فضا ہی آپ کی حق دار ہیں آیان..... انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ آپ نے انہیں میرے بارے میں سب بتا رکھا ہے اور ابھی ان کی محبت کو سبب قبولیت بھی نہیں بخش..... لیکن وہ تو اب بھی یہی سمجھتی ہیں کہ میرا آئیڈیل اور میری محبت کوئی اور ہے..... آپ نہیں..... اور اب میں یہ بات انہیں بتا کر ان کا حق کبھی غصب نہیں کروں گی..... شاید مجھے اس وقت آپ پر بھی اپنے دل کے یہ بھید ظاہر نہیں کرنے چاہیے تھے..... لیکن میں مجبور تھی..... میں نہیں چاہتی تھی کہ آپ تمام عمر اس خلش کے ساتھ گزار دیں کہ میں نے آپ کو کبھی ٹھکرایا تھا.....“ میں گم سم کھڑا گہنا کی تمام بات سنتا رہا اور مجھ سے تو یہ بھی نہیں بولا گیا کہ ایک خلش ختم کر کے اس سے بڑی خلش دے جانا کہاں کا انصاف ہے.....؟؟“ میں بس آپ سے اتنا ہی کہنا چاہتی.....“ گہنا کی بات ابھی ادھوری تھی کہ اچانک قدموں کی چاپ اور فضا کے دھیرے سے کھٹکارنے کی آواز سنائی دی ”معافی چاہتی ہوں لیکن آپ دونوں

کی بات میں خلل ہوتا ہی پڑا۔۔۔۔۔ دراصل گہنا کی امی جان تین چار مرتبہ ان کا پوچھ چکی ہیں۔۔۔۔۔ اور اب تو باقاعدہ شہین کے ہاتھ پیغام بھی آچکا ہے۔۔۔۔۔ دیر بھی کافی ہو چکی ہے۔۔۔۔۔ لہذا یہ ملاقات آپ دونوں کو اب یہیں درخواست کرنی پڑے گی۔۔۔۔۔ ”باقی آئندہ“ کا بورڈ لگا کر۔۔۔۔۔“فضہ کی شکستگی نے ہمیں بھی مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ گہنا نے نظر اٹھا کر میری جانب دیکھا اور وہ دھیرے سے خدا حافظ کہہ کر پلٹ گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ اس کا آخری الوداع ہو۔ ایک لمحے میں میرا دل جیسے آخری بار دھڑک کر ساکت ہو گیا۔ نظر کیا تھی۔۔۔۔۔ ایک تیز دھار برجھی تھی جو گہنا کی آنکھ سے نکلی اور عین میرے دل میں پیوست ہو کر گزرتی تھی۔

وہ دونوں کب کی واپس جا چکی تھیں اور میں اب تک وہیں اپنی جگہ جامد کھڑا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرا ہر سفر آج یہاں آ کر ختم ہو گیا ہو۔ ایک بار پھر وہی زمانے بھر کا ڈاکو کہ جس کا نام دل جلوں نے عشق رکھ چھوڑا ہے۔ اس سیاہ رات کی تنہائی میں میرے دل کا سارا چین و قرار لوٹ کر چلتا ہوا تھا، اور میں پھر سے تنہی دامن اور لفافا ساجبت کی پگڈنڈی پر کھڑا اس تاریکی میں اپنے مقدروں کو رو رہا تھا۔ ساری رات ٹھنڈ میں یوں باہر کھڑے رہنے نے صبح تک اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا اور سورج نکلنے سے پہلے میں شدید تیز بخار میں پھنک رہا تھا۔



شکنجہ

شکنجہ ناول پاکستان میں ہونے والی تخریب کاری کے پس منظر میں لکھا گیا ہے ہمارے ہاں گذشتہ کچھ سال سے ”ٹریک ٹو ڈپلومیسی“ کا غلط فہم کچھ زیادہ ہی زور شور سے مچایا جا رہا ہے۔ باور کیا جاتا ہے کہ محبتوں کے جوتنگ آلود دروازے حکومتیں نہیں کھول سکیں وہ شاید عوام بلکہ عوام بھی نہیں دانشور خواتین و حضرات اپنی مساعی سے کھولنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

لیکن..... اس ٹریک ڈپلومیسی کی آڑ میں کیا گھناؤنا کھیل رچایا جا رہا ہے بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیاں ”بھولے بادشاہوں“ کو کس کس طرح اپنے جال میں پھانسی ہیں اور ان سے کیا کام لیا جاتا ہے۔ یہی اس ناول کا موضوع ہے۔

ایک اور بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ پاکستان اپنے ہاں ہونے والے ہر واقعے کی ذمہ داری ”را“ پر ڈال دیتا ہے۔ یہ بات کس حد تک سچ ہے؟ کس حد تک جھوٹ؟ شاید ان سوالات کے جواب بھی آپ کو اس ناول کے مطالعے سے مل جائیں۔ محبتوں کی آڑ میں منافقتوں کا دھندہ کون چلا رہا ہے؟ دشمن کی سازش کیسے انجام پاتی ہے اور اس سازش کا شکار ہم انجانے میں کیسے بن جاتے ہیں میں نے یہی بتانے کی کوشش کی ہے۔ یہ ناول کتاب گھر کے ایکشن ایڈیٹر جاسوسی سیکشن میں پڑھا جاسکتا ہے۔

باب 35

قدرت کی یہ کیسی ستم ظریفی تھی کہ کبھی مجھے ایک محبت بھی میسر نہیں تھی، اور میں زمانے بھر سے بے زار ہو کر یعقوب مینشن کے جوگ میں پڑنے کے بعد خود کو بھی بھلا بیٹھا تھا اور آج جب مجھ سے محبت کی دعوے دار وہ دو گھنٹہ گزرا نا زینیں تھیں کہ جو بذاتِ خود اپنے اندر محبت کی اک تکمیل اور عمر بھر کا جوگ لیے جانے کے قابل تھیں..... تب بھی میں اُسی قدر تنہا تھا، شاید کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ محبت کبھی مکمل نہیں ہو پاتی۔ یہ ایک سدا کا ادھورا اور نامکمل جذبہ ہے جس کی تکمیل دنیاوی ملن کے بس کی بات نہیں۔

میری طبیعت کے پیشِ نظر رنگا اور موسیٰ کو اپنی واپسی بھی ایک آدھ دن کے لیے مؤخر کرنی پڑی۔ صبح سے فضلہ بیسیوں مرتبہ صحن اور حویلی کی دیگر خادماؤں کے ہاتھ پیغام بھیج کر میری طبیعت کے بارے میں پوچھ چکی تھی۔ گہنا نے رات ٹھیک ہی کہا تھا کہ میری اس نئی زندگی کی بنیاد ڈالنے والی فضلہ ہی تھی۔ میں آج اگر اس معاشرے میں محترم تھا تو یہ سکھ بھی مجھے فضلہ کے ساتھ سے ہی ملتی تھی۔ وہ میری ایسی محسن تھی جس نے میرے اندر کے آیان کو یہ حوصلہ اور اعتماد بخشا تھا کہ جس سے مجھے زندگی کی راہیں چننے اور منزلیں سر کرنے کا ہنر ملا تھا۔ تو میں اب منزل پر پہنچ جانے کے بعد اپنے رہبر کو، اپنے خضر کو کیسے بھول سکتا تھا؟

اور فضلہ تو پہلے ہی مجھے تمام عمر انتظار کرنے کا عندیہ دے چکی تھی کہ میں جب بھی اپنی منزل پر پہنچ کر اُسے پکاروں گا..... وہ میرے ہم قدم ہوگی۔ گہنا بھی یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ میں اپنی محسن کو اپنے انتظار کی سولی پر لٹکا کر خود کوئی منزلیں سر کرنے کبھی نہیں نکلوں گا۔ اسی لیے اُس نے خود مجھ سے دست بردار ہو کر یہ قربانی دینے کی ٹھان لی تھی۔ زندگی کے دورا ہوں سے بڑا معمہ اس جہاں میں کوئی اور نہیں ہو سکتا، یہ معمے بنانے والے بھلا کیا معمہ جوڑتے ہوں گے۔ کوئی جا کر انہیں سمجھائے۔

آخر سہ پہر تک فضلہ سے صبر نہیں ہوا اور وہ خود میری طبیعت کا پوچھنے میرے کمرے میں چلی آئی ”یہ آپ کو اچانک کیا ہوا.....؟..... ابھی کل رات تک تو آپ بھلے چنگے تھے.....“

”شائد رات کو دیر تک باہر رہنے سے سردی لگ گئی ہے..... آپ پریشان نہ ہوں..... مجھ پر بدلتے موسم دوسروں کی نسبت کچھ زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ جلد ٹھیک ہو جاؤں گا.....“ فضلہ نے غور سے میری جانب دیکھا ”پھر کوئی موسم بدل گیا ہے کیا.....؟“ میں چونک گیا، لیکن اس کے چہرے پر وہی سدا کی ملاحظہ بکھری ہوئی تھی..... میں نے دھیرے سے جواب دیا ”کچھ لوگوں کے مقدر کا موسم سدا ٹھہرا رہتا ہے اور کچھ جیسے بھی ہوتے ہیں کہ جن کا نصیب ہر بل کروٹ بدلتا رہتا ہے..... آپ سے تو کچھ چھپا نہیں..... سب آپ کے سامنے ہی ہے.....“ فضلہ کے چہرے پر بشاشت آ گئی ”ہاں..... آپ کا تمام سفر میرے سامنے ہے..... اور مجھے فخر ہے کہ میں بھی آپ کے اس سفر کے ایک چھوٹے سے پڑاؤ کی ہم سفر رہی ہوں.....“

”آپ ہم سفر نہیں..... میری رہبر ہیں..... اور سدا رہیں گی.....“ فضلہ نے مان سے پوچھا.....

”آیان..... آپ کو یاد ہے ناں..... آپ نے مجھ سے کچھ وعدہ کیا تھا۔ کچھ انعام دینے کا.....“

”جی مجھے یاد ہے..... اور آپ نے کہا تھا کہ وقت آنے پر آپ اپنا انعام خود مانگ لیں گی..... میں ابھی تک اُس وقت کا انتظار کر رہا ہوں.....“

”تو بس پھر سمجھ لیں کہ وہ وقت آنے والا ہے آیان..... اس بار آپ کو زمر دھولی سے رخصت ہونے سے پہلے مجھے میرا انعام دے کر ہی جانا ہوگا.....“

میں نے فضہ کے چہرے پر ایک عجیب سا اطمینان دیکھا، جیسے اُسے وہ انعام مانگ کر ساری کائنات مل جائے گی..... میں نے دھیرے سے جواب دیا ”آپ مجھے کبھی وعدہ خلاف نہیں پائیں گی.....“ فضہ کھل گئی ”تو بس پھر طے رہا..... آپ اب تیار رہیں گے..... زیادہ وقت باقی نہیں رہا..... لیکن اُس سے پہلے مجھے کچھ اپنوں سے بات کرنی ہے.....“ فضہ مجھے ایک نئی پہیلی میں ڈال کر خود وہاں سے چل پڑی۔ شاید وہ حتمی طور پر مجھ کو مجھ سے مانگنے سے پہلے اپنے بزرگوں کو اعتماد میں لینا چاہتی تھی۔ خانم تو پہلے ہی اس کی دل آشتیاں تھیں۔

مغرب تک میری حالت کچھ سنبھل گئی۔ میں تازہ ہوا میں چہل قدمی کی نیت سے بڑے والان کی جانب نکل آیا، اور وہاں نواب صاحب، پاشا موسیٰ اور رنگا کو کرسیاں ڈالے بیٹھا دیکھ کر ان کی جانب چلا آیا۔ نہ جانے مجھے ایسا کیوں لگا کہ رنگا اور موسیٰ کی آنکھیں کچھ نم ہیں، اور وہ گم سم سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ مجھے دیکھ کر نواب صاحب نے جلدی سے کہا ”یہ لیں..... اپنے آیان میاں بھی آگئے..... ان کی رائے بھی لینا ضروری ہے.....“ میرا دل زور سے دھڑکا۔ نہ جانے میری آمد سے قبل وہاں کیا گفتگو چل رہی تھی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے رنگا کی جانب دیکھا لیکن وہ رقت آمیز کیفیت میں مبتلا تھا۔ آخر موسیٰ نے ہی یہ جان لیا وہاں موسیٰ توڑی ”شہزادے..... نواب صاحب نے ہم سے رشتہ جوڑنے کی بات کی ہے.....“

”کیا.....؟..... کیا مطلب.....؟“ موسیٰ کی آواز جذبات سے لبریز تھی ”وہ ہماری لاڈلی کو اپنے جھوٹے بیٹے وقار کی لہن بنانا چاہتے ہیں..... اس حویلی کی بہو بنانا چاہتے ہیں.....“ اور پھر یہ سن کر میری اپنی حالت بھی سارنگا سے کچھ مختلف نہیں رہی..... اگلے ہی لمحے میں اٹھ کر اپنی نم آنکھیں چھپاتے اس مجبور باپ کو اپنے سینے سے لگا چکا تھا جسے عمر بھر بس اسی خدشے اور فکر نے مارے رکھا کہ اُس کی بیٹی کو نہ جانے کوئی عزت دار گھر قبول کرے گا بھی یا وہ ساری عمر کسی اچھے رشتے کی آس میں اپنے گھر کی چوکھٹ پار نہیں کر پائے گی..... لیکن آج قدرت نے کتنا بڑا انعام اس باہل کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ رنگا کو اب تک یقین نہیں آ رہا تھا لہذا میں نے ہی ناہید کے بھائی کی حیثیت سے نواب صاحب کو جواب دیا ”ہمارے لیے اس سے زیادہ خوش قسمتی کی بات کیا ہوگی نواب صاحب..... کہ ہماری ناہید آپ کی بہو بن کر اس حویلی میں اترے..... لیکن کیا آپ نے وقار سے اس کی مرضی معلوم کر لی ہے..... کہیں اُس کو کوئی.....“ نواب صاحب نے جلدی سے میری بات کاٹ دی ”نہیں نہیں..... سچ تو یہ ہے کہ یہ خود وقار کی بھی مرضی ہے..... اس نے سب سے پہلے خانم سے اپنی پسند کا تذکرہ کیا تھا اور بھی خانم تو پہلے دن سے ہی ناہید کی گرویدہ ہیں..... بس اب آپ لوگ ہاں کر دیں تو ہم منگنی کی رسم کی تیاری شروع کریں.....“ رنگا کی آواز ابھی تک بھرائی ہوئی تھی ”ناہید اب آپ کی بیٹیا ہے نواب صاحب..... جو مناسب سمجھیں طے کر دیں.....“ موسیٰ اور رنگا نے فردا فردا اٹھ کر نواب صاحب کو گلے لگایا۔ پاشا صاحب بھی بہت خوش نظر آ رہے تھے، رنگا نے

میرے ہاتھ تھام لیے ”دیکھ لے ساجن۔۔۔ یہ سب تیرے دم سے ہے۔۔۔ اب تو ہی اپنی بہنا کو رخصت بھی کرے گا۔۔۔ میں اور لاڈلی کا یہ چچا موسیٰ تو بس ڈولی سجا ئیں گے اُس کی۔۔۔ رنگا تیرے آنے سے پہلے اتنا خوش قسمت کب تھا بھلا۔۔۔؟“

اور پھر چند لمحوں میں ہی ناہید کے رشتے کی بات ساری حویلی میں پھیل گئی۔ میں نے اسے بلوا کر خصوصی طور پر اس کی مرضی معلوم کی لیکن اس کا جواب بڑا سادہ تھا ”جو آپ کی اور بابا کی پسند۔۔۔ وہی میرا مقدر ہوگا آیاں بھائی۔۔۔“

نواب صاحب نے دو روز بعد ہی ناہید اور وقار کی مہندی اور اگلے روز منگنی کی تقریب کا اعلان کر دیا۔ چاروں اطراف ایک ال چل ہی مچ گئی۔ رنگا اور موسیٰ نے تمام یعقوب مینشن سمیت ہمارے قریباً پورے محلے کو بھی تقریب میں مدعو کر رکھا تھا۔ نواب صاحب کی طرف سے خصوصی دعوت نامہ امی، ابا، برہان اور چھوٹی کے نام خود پاشا اور رنگا جا کر دے آئے تھے، محلے سے منشی بالا اور راجہ ایک دن پہلے ہی حویلی پہنچ گئے اور محلے کی شادیوں کی طرح وہ یہاں بھی خدائی خدمت گاروں کی طرح حویلی کی سجاوٹ اور دیگر انتظامات میں جٹ گئے۔ راجہ نے مجھے گرم سم بیٹھا دیکھ کر چیخڑا۔۔۔

”کیوں اٹو۔۔۔ کہے تو تیرے حصے کی لڑیاں بھی سجا دوں۔۔۔ سنا ہے وہ تیرے شیخ صاحب کے گھر والے بھی اب نہیں رہتے ہیں۔۔۔“

بالے اور منشی نے بھی شرارت سے ایک دوسرے کو آنکھ ماری، اب میں انہیں کیا بتاتا کہ ان کے تو کے مقدر میں کس کی لڑیاں لکھی ہوئی تھیں، تقریب کی شام ساری زمر دھوپیلی واقعی کسی انمول گینے کی طرح جگمگا رہی تھی، ابا اور امی کو رنگا نے خاص درخواست کر کے ناہید کی طرف سے اس کے بزرگ مقرر کر رکھا تھا۔ میں بہت دیر تک اس شور اور ہنگامے کو بیٹھا دیکھتا اور یہ سوچتا رہا کہ جب میں اپنے گھر سے نکلا تھا تب میرا خاندان صرف چار افراد پر جبنی تھا لیکن آج میرا گھرانہ کتنا پھیل چکا تھا۔ منگنی کی تقریب میں میں نے ستارہ اور شیخانی جی کو بھی چھوٹی کے ساتھ مختلف کاموں میں مصروف دیکھا لیکن گہنا مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ میرا جی چاہا کہ پاس سے گزرتے شیخ صاحب سے اس کا پوچھوں لیکن میں چپ ہی رہا۔

شائد گہنا بھی اس وقت میری طرح خود اپنے اندر لگے تمام آئینوں سے فرا چا ہتی ہو گئی تھی وہ اس ہنگامے کا حصہ نہیں بن پائی تھی۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک فضا کی آواز نے مجھے چونکا دیا ”آپ یہاں تنہا کیوں بیٹھے ہیں آیاں۔۔۔“ میں نے سننے کی کوشش کی ”کچھ نہیں بس شائد کچھ تھکن ہو گئی ہے۔۔۔“ فضا نے میری آنکھوں میں جھانکا ”آپ ابھی سے تھک گئے۔۔۔ ابھی تو بڑا لمبا سفر باقی ہے۔۔۔“ میں نے مسکرا کر فضا کو دیکھا ”پھر تو مجھے تحریک دینے کے لیے میرے ہم سفر کو معمول سے کچھ زیادہ محنت کرنا ہوگی۔۔۔ مجھے اپنے ساتھ ہم قدم رکھنے کے لیے۔۔۔“ فضا کی آواز لرزی گئی ”اور اگر ہم سفر گہنا جیسی آپ کے دل کی محرم ہو تو۔۔۔ پھر۔۔۔ کیا پھر بھی آپ کے قدم نہیں اٹھ پائیں گے۔۔۔“

میں چونک کر کھڑا ہو گیا۔ ”گہنا۔۔۔؟“ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔۔۔؟“ فضا کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں۔ ”ہاں آیاں۔۔۔ گہنا۔۔۔ وہی آپ کی اصل ہم سفر ہے۔۔۔ میں تو بس ایک عارضی سرانے تھی جسے آپ کی کچھ دن کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔ آپ کی آخری منزل کی ساتھی گہنا ہی ہے۔۔۔“

”کیا آپ سے گہنا نے کچھ کہا ہے۔۔۔؟“

”نہیں آ یاں۔۔۔ وہ آپ کی پسند ہے۔۔۔ وہ جیتے جی کبھی مجھ سے اپنا غم نہیں بانٹے گی۔۔۔ اُس رات جب میں گہنا کو بلانے کے لیے آئی تھی تو میں نے آپ دونوں کی باتیں سن لی تھیں۔۔۔ مجھے اس فیصلے پر پہنچنے میں بڑی دشوار راہوں سے گزرتا پڑا ہے آ یاں۔۔۔ میں آج آپ کو اپنی محبت سے آزاد کرتی ہوں۔۔۔ محبت دو طرفہ نہ بھی ہو تو وہ دوسرے کو کسی نہ کسی ڈور میں باندھ رکھتی ہے۔۔۔ میں آج یہ ڈور خود توڑ رہی ہوں۔۔۔“

میں فضا کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بے چین ہو گیا۔

”لیکن آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں۔۔۔ میں نے گہنا سے کوئی اقرار نہیں باندھا“

”جانتی ہوں میں۔۔۔ اور یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ دونوں ہی اتنے اعلیٰ ظرف ہیں کہ ساری عمر اس ان بندھے بیان کو میری خاطر یونہی بے نام ہی رہنے دیں گے لیکن میں ایسا نہیں چاہتی۔ میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا آ یاں۔ محبت میں کوئی احسان نہیں ہوتا، نہ ہی محبت میں کوئی ”دان“ ہوتا ہے۔ میں اور آپ اس دان اور احسان کے بوجھ کے بناء تمام عمر ایک دوسرے کے اچھے دوست اور اچھی یاد بن کر بھی تو رہ سکتے ہیں، اور آپ کا ساتھ چاہے کسی بھی صورت میں ہو۔۔۔ میرے لیے اعزاز ہوگا، محترم ہوگا۔۔۔“

میں اب بھی الجھا ہوا تھا کیونکہ فضا کی بہتی آنکھیں اس کے الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ ”میں نے آغا جان کو منالیا ہے کہ وہ مجھے دوبارہ تہران یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی اجازت دے دیں۔ دو دن کے بعد میں مومو کے ساتھ ایران چلی جاؤں گی آ یاں۔۔۔ لیکن جانے سے پہلے آپ کو حسب وعدہ میرا انعام مجھے دینا ہوگا۔ بولیں۔۔۔ دیں گے نا۔۔۔؟“

خود میری آواز بھی ڈوبتی جا رہی تھی ”آپ میری جان بھی انعام میں مانگ سکتی ہیں فضا۔۔۔ آپ کہہ کر تو دیکھیں۔۔۔“

فضا نے اپنی ستارہ پلکوں کے موتی اپنی ہتھیلیوں کے چاند میں جذب کرنے کی ناکام کوشش کی، ”آپ کی جان پر اختیار چاہیے مجھے۔۔۔“

میں نے ہتھیرا ڈال دیے۔

”مجھے منظور ہے۔۔۔“ فضا نے اپنی تمام ہمت مجتمع کی ”میں جانتی تھی آپ میرا مان ضرور رکھیں گے۔۔۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ ابھی حویلی کے صحت سے جڑے بڑے چوبارے پر چلے جائیں۔ گہنا وہاں آپ کا انتظار کر رہی ہے۔۔۔ میں اُسے بتا کر آئی ہوں کہ آپ وہاں اُس سے ملنے کے لیے ضرور آئیں گے۔۔۔“

”لیکن آپ۔۔۔ فضا۔۔۔ آپ یہ سب کیوں۔۔۔“ فضا نے میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کاٹ دی ”آپ خود پر میرا اختیار مان چکے ہیں آ یاں۔۔۔ اور میں نے کہا نا کہ محبت میں کوئی دان، کوئی احسان نہیں ہوتا۔۔۔ میں جانتی ہوں کہ آپ اور گہنا ایک دوسرے کے بناء سدا ادھر رہیں گے۔۔۔ اور میں نہیں چاہتی کہ میرے دو عزیز ترین اور سب سے پیارے دوست یوں عمر بھر ادھوری زندگی جنیں۔۔۔“ میری ہچکچاہٹ ابھی باقی تھی۔۔۔ ”لیکن گہنا۔۔۔“

”میں اس سے بات کر چکی ہوں۔۔۔ وہ تو آپ سے بھی کہیں زیادہ ضدی ہے لیکن میں نے اپنی دوستی کا واسطہ دے کر اُسے بھی منالیا ہے۔۔۔ وہ آپ کے بناء کبھی خوش نہیں رہ سکتی آ یاں۔۔۔ جائیں دیر نہ کریں۔۔۔ اپنی گہنا کے بھرم میں اب کوئی دراڑ نہ آنے دیجئے گا۔۔۔ میری دعائیں

سدا آپ دونوں کے ساتھ رہیں گی.....“ فضلہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے چھت کی جانب جاتی ہوئی راہ پر دھکیل دیا۔ میرا جی چاہا کہ میں اس کے ہاتھ تھام کر اس سے پوچھوں کہ اتنی چھوٹی سی عمر میں اس نے اتنا بڑا تیاگ کہاں سے سیکھ لیا ہے؟، لیکن پھر مجھے اپنے سوال پر خود ہنسی آ گئی، بھلا محبت سے بڑا استاد اس جہاں میں اور کوئی کیا ہوگا؟ محبت از خود دنیا کا سب سے بڑا جوگ اور سب سے عظیم تیاگ ہے۔ عشق ہی انسان کو جوگی بناتا ہے۔ پیار، محبت اور عشق..... یہی تو آخری تین منزلیں ہوتی ہیں پر تیاگ کی۔

میں دھڑکتے دل اور لرزتے قدموں کے ساتھ چو بارے پر پہنچا تو نیچے حویلی کے دالان میں ہوتی آتش بازی کی پھل جھڑیاں دور فضا کی بلندی میں پھوٹنا شروع ہو چکی تھیں۔ گہنا کسی گہری سوچ میں گم چو بارے کی منڈیر کے پاس کھڑی تھی اور آسمان میں اپنی گلابی روشنی کے ستارے چھوڑتی آتش بازی کی ضیا سے اس کا چہرہ بھی دمک رہا تھا۔ سفید آنچل کے نور تلے وہ گہنا کا گلابی چہرہ خود آسمان میں پھونٹے کسی شرارے کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ میں کچھ دیر مبہوت سا کھڑا اُسے دیکھتا رہا.....

میرے قدموں کی آہٹ سن کر اس نے اپنی جھکی پلکیں اٹھائیں..... ”آپ آگئے آ یاں..... بہت انتظار کروایا آپ نے مجھے.....“ میں نے دھیرے سے جواب دیا ”بڑی لمبی مسافت طے کر کے یہاں تک پہنچا ہوں..... کسی کے ظرف کی میز حیاں طے کر کے کسی بلندی پر پہنچنا بہت مشکل ہوتا ہے.....“

”جانتی ہوں..... میں خود بھی یہاں آنے سے پہلے ایسی ہی کسی کیفیت سے دوچار تھی..... لیکن مجھے نہ جانے کیوں یہ یقین تھا کہ وہ آپ کو بھی منا کر یہاں بھیج دے گی..... تقدیر نے ہم تینوں کے ساتھ کیا کھیل کھیلا ہے آ یاں..... ہم تینوں کے دل میں وہ یہ جذبے کیوں جگا گئی؟..... اور اب مقدر خود دور بیٹھ کر ہمارا تماشا دیکھ رہا ہوگا۔ یہ کیا انصاف ہے؟“۔

”محبت کا خود اپنا ایک نظام عدل ہوتا ہے گہنا..... اور بد قسمتی سے اُس کا انصاف بہت کم خوش نصیبوں کو اس آتا ہے..... محبت کی تکون میں ایک کونا سدا ہی سزاوار ٹھہرتا ہے.....، اور ہماری محبت کی تکون میں یہ سزا فضلہ نے ہم دونوں کی خاطر خود اپنے لیے تجویز کی ہے..... حالانکہ اُسے خود کے لیے جزام چنے کا اختیار بھی حاصل تھا، لیکن یہ اس کا ظرف ہے کہ اس نے ہم دونوں کو سزاوار نہیں ٹھہرایا..... اور ہمارے نصیب کی تکون سے اپنا سزاوہ علیحدہ کر کے ہمیں ملا دیا.....“

گہنا نے نظر بھر کے مجھے دیکھا ”آپ اس ملن سے خوش تو ہیں نا آ یاں.....؟“۔ ”میری ہر خوشی اب آپ سے وابستہ ہے گہنا جی..... میرے دل کی حالت جاننے کے لیے اب آپ کو ہمیشہ خود اپنے اندر جھانکنا پڑے گا.....“ گہنا نے شرارت سے میری جانب دیکھا ”لیکن میرا دل تو کچھ اور کہہ رہا ہے.....“ میں چونک سا گیا ”کیا کہتا ہے آپ کا دل.....؟“۔

گہنا کے ہونٹوں پر اس کی مخصوص مسکراہٹ ابھری ”جو دل کی باتیں جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں..... وہ سوال نہیں پوچھا کرتے..... بس خود جھانک کر پڑھ لیا کرتے ہیں.....“ میں بھی مسکرا دیا ”ہاں..... شاید دلوں کی تحریر پڑھنے کا فن بھولتا جا رہا ہوں..... بہت سے وعدے ہیں جو نبھانے ہیں..... اپنوں نے بہت سی امیدیں وابستہ کر لی ہیں اپنے اس نکتے اٹھ سے.....“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

”لیکن میں جانتی ہوں کہ آپ اُن سب کی امیدوں پر ضرور پورا اتریں گے۔ میں اس امتحان میں ہر قدم آپ کے ساتھ ہوں۔“

”تو پھر وعدہ کریں کہ جب تک میں اپنی منزل پر نہیں پہنچ جاتا۔۔۔ آپ میرا انتظار کریں گی۔۔۔ ابھی بہت سی آنکھوں کے آنسو چننا باقی ہیں۔۔۔ یہ تو سفر کا آغاز ہے۔۔۔ مجھے اپنے علاقے کے لوگوں کے خواب تعبیر کرنا ہیں۔۔۔ بولیں۔۔۔ دیں گی میرا ساتھ۔۔۔؟“

”میں زندگی کی آخری سانس تک آپ کا انتظار کروں گی آیاں۔۔۔ اور آخری دم تک آپ کا ساتھ دوں گی۔“

میں نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ”وعدہ۔۔۔“

گہنا نے پلکیں اٹھا کر میری آنکھوں میں جھانکا اور پھر اپنا نازک ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا ”وعدہ۔۔۔“

ہم دونوں مسکرا دیے۔ آسمان پر ایک ساتھ بہت سی بھل جھڑیاں چھوٹیں اور فلک بھی گہنا کے پُر نور چہرے کی طرح گلنار ہو گیا۔

(ختم شد)

کرشن چندر کے بہترین افسانے

کرشن چندر کے بہترین افسانے، مشہور افسانہ نگار کرشن چندر کے افسانوں پر مبنی ہے، اس کتاب میں اُن کے افسانے، برے پھینے، زندہ نواذر، نیوٹرل زون، ٹیسریچر، پرنس فیروز، تائی ایسری، جاسن کا بیڑ، بھیا جی، سا جھے کا مردہ، ملکہ کی آمد، داتن والے، جولی کیکساں، شنو، خوشی، پینگ پینگ فٹنگ، آؤ مرجائیں، ٹیکسی ڈرائیور، کچرا بابا، تہائی کا پھول، سپاہی۔ کرشن چندر نے ہمیں فلم انڈسٹری کے لئے بھی کام کیا جہاں انہیں فلم نگری کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور اپنے انہیں مشاہدات کو بنیاد بنا کر انہوں نے اپنا مشہور ناول ”چاند کا گھاؤ“ لکھا جو کہ ہمیں فلم انڈسٹری کی ہی کہانی ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ کشمیر میں بھی گزارا اسلئے ان کے کچھ ناولوں کا پس منظر کشمیر کے زندگی پر مشتمل ہے۔

کرشن چندر کے بہترین افسانے کتاب گھر کے افسانے سیکشن میں پڑھی جاسکتی ہے۔